تفہیم
مباحث
فی
علوم القرآن
www.KitaboSunnat.com
تفہیم و تلخیص
محمد جمیل شیدا رحمانی
آزاد بک ڈپو، اردو بازار، لاہور، پاکستان

درجہ عالیہ طلبا وطالبات وفاق سلفیہ نصاب کیلئے

تفہیم
مباحث فی علوم القرآن

منّاع القطان

تفہیم وتلخیص

محمد جمیل شیدا رحمانی

آزاد بک ڈپو، اردو بازار، لاہور

042 - 37120106 - 37248127

☆ نام کتاب: تفہیم مباحث فی علوم القرآن

☆ تفہیم و تلخیص: محمد جمیل شیدا رحمانی

☆ ناشر: آزاد بک ڈپو لاہور

☆ پریس: گنج شکر پرنٹرز لاہور

☆ اشاعت: اوّل 2009ء

☆ تعداد: 500

قیمت: 100/- روپے

فہرست

مقدمہ

قرآن کریم پوری انسانیت کو ذلت اور پستی کی اتھاہ گہرائی سے اٹھا کر عزت و سرفرازی کی بام عروج تک پہنچانے کا ضامن ہے۔ مگر صد حیف کہ اس پر ایمان لانے کی دعویدار امت عرصہ دراز سے ذلت و ادبار کا شکار ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملتِ مسلمہ نے اپنے مرکز قرآن و سنت رسول ﷺ سے اپنا ربط و تعلق ختم کر لیا ہے۔ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی تہذیب کو اختیار کر لیا ہے۔ قرآنی علوم کو سمجھنا تو درکنار اس کی سادہ تلاوت سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ جب تک ملتِ مسلمہ قرآن سے وابستہ اور اس کے احکام پر عمل پیرا رہی۔ اس وقت تک رفعت و سرفرازی کے منصب پر فائز رہی۔ اور جب سے اس نے قرآنِ کریم سے اپنا رشتہ توڑا ہے اسی وقت سے یہ اپنا تشخص کھو چکی ہے۔

☆ انسان کسی مصنف کی بڑی سے بڑی دلچسپ کتاب کو ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دوسری دفعہ اس کے مطالعہ سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ مگر قرآنِ کریم ایسے جامع جواہر کا بحرِ ذخار ہے۔ کہ اسے بار بار پڑھنے سے نئے نئے لعل و جواہر منکشف ہوتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا عظمتِ قرآن کے بارے میں ایک بے بہا جملہ ہے "لا تنقضی عجائبہٗ" قرآن کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ جتنی دفعہ اسے پڑھو۔ نئے نئے اسرارِ حکمت تم پر منکشف ہونگے۔ مؤلف محترم نے اس تالیف میں اختصار کے ساتھ تمام قرآن علوم کا احاطہ کر دیا ہے۔ جہاں پانچ دس مثالیں بیان کی جاسکتی تھیں وہاں ایک دو جامع مثالیں ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ تاکہ قاری زیادہ بوجھ محسوس نہ کرے۔

ایم اے، عربی، ایم اے اسلامیات اور شہادۃ العالیہ کلاس کے مدارس اور طلبہ و طالبات نیز جج صاحبان اور اسلامی علوم سے دلچسپی رکھنے والے وکلاء اس تالیف سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اندازِ تحریر نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ فاضل مؤلف چونکہ عربی، فارسی، اردو، انگریزی، پنجابی پانچ زبانوں کے متبادل تراجم کا طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا اسلوبِ تحریر فصاحت و بلاغت کے محاسن سے مزین اور آراستہ ہے۔ لہٰذا مدرسین اور طلبہ و طالبات کے ہاتھ میں اس تالیف کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ قرآنی علوم کے مباحث پر وہ حاوی ہو سکیں۔

جہاں کوئی ابہام ہے۔ اُسے خطوطِ وحدانی کے اندر حل کر دیا ہے۔ اور جو لفظ لکھنے میں واضح نہیں ہے۔ اس کے اوپر یا نیچے صحیح خط سے وہ لفظ لکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر ابو صارم سلطان الحق

سوال نمبرا:۔علم کی تعریف کیجئے نیز علم کی ترقی پر تفصیلی نوٹ لکھئے۔
الجواب:۔حقیقی علم کی یہ تعریف ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی کو صحیح طور پر سمجھے اور ان کے مطابق عمل کرے۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو اپنے آخری نبی محمد ﷺ پر نازل فرمایا۔اور نبیؐ نے اپنے عمل سے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔اور قرآن کے علم کے لوگوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔اللہ تعالیٰ نبیؐ پر درود وسلامتی بھیجے اور صحابہء کرام پر بھی سلامتی نازل فرمائے جنہوں نے اس حقیقی علم کے مطابق اپنی زندگی بسر کی۔وہ قرآن کو اچھے طریقے سے سمجھتے تھے۔اور جب کسی آیت کی انہیں سمجھ نہ آتی تھی۔تو اس کے بارے میں وہ رسول اللہ ﷺ سے وضاحت طلب کرتے تھے۔اس بارے میں امام بخاری اور امام مسلم رحمھما اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔تفسیر میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے:جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿ الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم ﴾ صحابہؓ پر شاق گزرا۔اور عرض کیا:اے اللہ کے رسولؐ!ہم میں سے کون ہے۔جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو۔آپؐ نے فرمایا:اس کا یہ مطلب نہیں!کیا تم نے حضرت لقمان کا وہ قول نہیں سنا؟جو اس نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا؟ان الشرک لظلم عظیم۔رسول اللہ ﷺ نے قرآنی علوم کی وضاحت فرمادی کہ ظلم عظیم سے مراد شرک ہے۔چھوٹی بڑی کوتاہیوں کو ظلم عظیم نہیں کہا جاتا۔مسلم نے حنفیہ بن عامر سے روایت کیا ہے:کہ میں نے رسول اللہ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:﴿ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ﴾ صحابہ کو رسول اللہؐ نے قوت کی صراحت فرمادی:الا ان القوۃ الرمیُ الا ان القوۃ الرمیُ "سنو حقیقی قوت تیر اندازی ہے سنو!حقیقی قوت تیر اندازی ہے۔لھذا قرآن کے علم کی رسول اللہ ﷺ وضاحت فرمادیتے تھے۔

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ ہم میں جو آدمی سورۃ بقرہ یا سورہ آل عمران پڑھا ہوتا تو اُسے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ابو عبدالرحمٰن سلمی سے روایت ہے۔صحابہ جب دس آیات سمجھ کر سیکھ لیتے تھے۔جب تک ان پر عمل نہ کر لیتے تھے آگے نہ بڑھتے تھے۔انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اجازت نہ تھی کہ قرآن میں کچھ بھی اسکے علاوہ ملادیں۔مسلم ابوسعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ فرماتے تھے:تم مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھا کرو۔جو کوئی مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھ لے اسے مٹا ڈالے۔قرآن کے علاوہ جو مجھ سے سنو

۔قرآن اللہ کا انسان پر بہت بڑا فضل ہے۔اللہ نے اسے فطرتِ سلیمہ سے نوازا۔اس کی طرف دعوت دی۔اس طرح انسانیت پروان چڑھنے لگی۔آخر میں اللہ نے محمد ﷺ کے ذریعے اپنے علم کو ارتقاء بخشا۔فرمانِ رسولؐ ہے۔میری اور پہلے پیغمبروں کی مثال اس طرح ہے۔جیسے ایک آدمی نے اپنا گھر بنایا اور اُسے بہت خوبصورت کیا۔مگر ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی۔لوگ اسے دیکھ کر بہت خوش اور حیران ہوتے ہیں۔اور کہتے ہیں: اگر یہ اینٹ لگ جاتی تو اس بلڈنگ میں کوئی کمی نہ رہتی۔میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم الانبیاء ہوں۔قرآنِ کریم اس کا آخری پیغام ہے۔جو پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بھیجا گیا ہے۔اور محمد ﷺ بھی آخری رسولؐ ہیں۔ارشادِ ربانی ہے ﴿قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا﴾ (اے نبی) کہہ دیجئے: اے لوگو! میں تم سب لوگوں کیطرف اللہ کا رسول ہوں۔ہر نبی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا۔مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آخری نبی محمد ﷺ کے ذریعے اپنا آخری آسمانی پیغام قرآنِ کریم کی شکل میں بھیجا ہے۔جس کی آخری نبیؐ نے پوری وضاحت کردی ہے۔اس حقیقی علم پر مشتمل کتاب کے علم وتفہیم کو ترقی کی انتہائی منزل تک پہنچا دیا ہے۔یہ کتاب ایسا معجزہ ہے۔کہ عرب کے فصحاء وبلغاء اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تھے۔حالانکہ انہیں اپنی فصاحت وبلاغت پر بہت فخر تھا۔وہ اپنے علاوہ تمام انسانوں کو فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے گونگا سمجھتے تھے۔مگر قرآنی اسلوب کے مطابق ایک سورۃ بھی پیش نہ کرسکے۔جو بنیادی باتیں پہلی تمام شریعتوں میں موجود تھیں۔وہ قرآنِ کریم میں بھی موجود ہیں۔اور جو کمی پہلی شریعتوں میں موجود تھی۔وہ قرآنِ کریم اور آخری نبی محمد ﷺ کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے پوری کردی۔اللہ تعالیٰ مسلسل اپنے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجتا رہا تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہوجائے اور وہ قیامت کے دن کوئی عذر و معذرت پیش نہ کرسکیں۔انسانیت فطری طور پر اللہ کی طرف سے آئی ہے۔رسالت کے تحت مسلسل ترقی کرتی رہی۔وحی مناسب حالات میں بار بار آتی رہی۔اور ہر رسول کی قوم کے حالات میں وقتی مشکلات کا حل پیش کرتی رہی۔یہاں تک کہ اس میں پختگی پیدا ہوگئی۔

سوال:۔علوم قرآن سے کیا مراد ہے؟

الجواب:۔قرآنی علوم سے مراد وہ علوم ہیں۔جو قرآن کے اسبابِ نزول، (کی معرفت) قرآن کو جمع

کرنے ،اس کی ترتیب ۔سورۃ کی مکی اور مدنی ہونے کی پہچان ناسخ ومنسوخ کی معرفت، محکم اور متشابہ کا علم اور اس کے علاوہ ایسے امور پر مشتمل ہوں ۔جن کا قرآن کے ساتھ تعلق ہو۔ محکم وہ آیت ہے جس کا حکم واضح ہو۔اور اس میں کسی تاویل، حیلے اور ہیر پھیر کی گنجائش نہ ہو۔ متشابہ وہ آیات ہیں جن میں مکلف انسانوں کے لئے عمل کرنے سے متعلق کوئی حکم نہ ہو۔ان پر بغیر کسی تاویل کے ایمان لانے کا حکم ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ، آنکھوں، کانوں کا ذکر ہے۔جن لوگوں کے دل میں کجی ہوتی ہے ۔اور وہ محکم آیات پر عمل کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں۔وہ متشابہ آیات کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے خواہ مخواہ ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں ۔اور عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں ۔جیسے گمراہ ٹولہ مشبہہ اللہ تعالیٰ کے اعضاء کی پیمائش میں سرگرداں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ کتنی لمبی ہے۔اللہ کا کان کتنا بڑا ہے۔ اللہ کا ہاتھ کتنا لمبا ہے۔اللہ تعالیٰ کی پنڈلی کتنی لمبی ہے۔ان کا سارا زور اسی پیمائش پر صرف ہو رہا ہے۔کوئی ان سے پوچھے کہ تمہیں ان اعضاء کی پیمائش کی ذمہ داری کس نے عطا کی ہے۔تمہیں تو یہی حکم ہے کہ بغیر تاویل کے ان آیات پر ایمان لاؤ۔مگر یہ احمق اللہ کے اعضاء کو اپنے اعضاء سے تشبیہ دے کر اندھیرے میں لاٹھی چلا رہے ہیں ۔علوم قرآن کا مفسر کے لئے جاننا بہت ضروری ہے۔تاکہ وہ مفسر قرآن کا حق صحیح طور پر ادا کر سکے۔

سوال:۔قرآن کی تعریف کیجئے۔

الجواب:۔قرأ کا معنی جمع کرنا اور ملانا ہے۔القرآۃ کا معنی حروف وکلمات کو ایک دوسرے کے ساتھ اچھی ترتیب سے ملانا، القرآن دراصل مصدر ہے۔قرأ قرآءۃ وقرآنا، ارشاد باری سورۃ القیامۃ کی آیات نمبر 17، 18، میں ہے ﴿إِنَّ علینا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه﴾ اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔سو جب ہم پڑھیں تو اس کے پڑھنے کی پیروی کریں۔یہ فُعلان کے وزن پر مصدر ہے۔ جیسے الغفران اور الشکران ہے۔قرآن کی ہر آیت کو قرآن کہا جاتا ہے۔یہی مفہوم راجح ہے۔کچھ لوگوں نے قرآن کی اور توجیہات بھی کی ہیں۔مگر وہ مرجوح ہیں۔پہلی توجیہ سے کم درجے کی ہیں۔القرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔لہذا قرآن اسم جنس ہے اس میں ہر کلام شامل ہے۔اس کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔اس اضافت نے ہر کلامِ غیر کو اس سے خارج کر دیا ہے۔سورۃ لقمان آیہ نمبر 27، میں ارشاد باری ہے ﴿ولو ان ما في الارض من

شجرۃ اقلام و البحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ﴾ اگر زمین کے تمام درختوں کے قلم بنا دیئے جائیں اور (سیاہی کے) سات سمندر بھی ہوں۔ (اور تمام جن وانس لکھنے بیٹھ جائیں) تو بھی اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہیں ہونگے۔ المتعبد بتلاوتہ، یعنی اس کی تلاوت کے ساتھ عبادت کی جاتی ہے۔ اس صفت کے ساتھ تمام احادیثِ قدسیہ خارج ہو جاتی ہیں۔ اگر چہ احادیث قدسیہ بھی اللہ تعالیٰ کے الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ مگر ان کے ذریعے عبادت کرنے کا حکم نہیں جیسے قرآنِ کریم کے نماز وغیرہ میں پڑھنے کا حکم ہے۔

سوال:۔ قرآن کے اسماء واوصاف پر مفصل نوٹ لکھیئے۔

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بہت سے نام رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک نام 'القرآن' ہے ﴿ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم ﴾ (الاسراء آیہ نمبر 9) یہ قرآن اس (راستے کی طرف) رہنمائی کرتا ہے۔ جو بہت درست اور مضبوط ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر 10 میں اس کا نام الکتاب ہے۔ اور سورۃ الفرقان کی آیہ نمبر 1 میں اس کا نام، الفرقان، ہے۔ ﴿تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیرا ﴾ بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل کیا تاکہ تمام جہان والوں کو (اللہ کے عذاب) سے ڈرادے۔ سورۃ الحجر کی آیت نمبر 9 میں اسے الذِکر کا نام دیا گیا ہے۔ سورۃ الشعراء کی آیت نمبر 192 میں اس کا نام، التنزیل رکھا گیا ہے۔ اس کے تمام ناموں میں غالب نام القرآن اور الکتاب ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز کہتے ہیں۔ قرآن نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسے زبانوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اور الکتاب نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسے قلموں کے ذریعے لکھا جاتا ہے۔ ان دو ناموں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ اسے دو مقامات میں محفوظ رکھا جائے۔ ایک سینوں میں دوسرا کتابت میں۔ ہم سینوں کی حفاظت پر اس وقت اعتماد کرتے ہیں۔ جب وہ قرآن مکتوب کے مطابق ہو۔ جس پر صحابہ اور پوری امت کا اجماع ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو قیامت تک اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ وہ مستند اور احسن طریق سے پورا ہو۔ پہلی آسمانی کتابیں ایک مقرر وقت تک مخصوص تھیں۔ ان میں ہدایت اور ہمیشگی کا وعدہ نہیں تھا۔ لہذا ان قوموں نے ان کی تحریف وتبدیل سے ان کے اکثر احکام کو ختم کر دیا۔ مگر قرآنِ کریم کے نزول کو چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس میں ایک

حرف کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔

سوال:۔اوصافِ قرآن پر نوٹ لکھیے:

الجواب:۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے بہت سے اوصاف بیان کئے ہیں۔ان میں سے ایک وصف نور ہے۔جس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت نمبر 174 میں ہے۔﴿ یا ایھا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا ﴾ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آچکی ہے۔اور ہم نے تمہاری طرف کھلا اور واضح نور نازل کیا ہے۔

سورۃ یونس کی آیۃ نمبر 57 میں اسے ہدایت، شفا، رحمت اور موعظت (نصیحت) کے نام دیئے گئے ہیں۔سورۃ الانعام کی آیۃ نمبر 92 میں اس کا وصف مُبارک بیان کیا گیا ہے۔سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 5 میں اس کا وصف 'مبین' ذکر کیا گیا ہے۔سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 97 میں اس کا وصف، بشریٰ بیان کیا گیا ہے۔﴿ مصدقا لما بین یدیہ وھدیً وبشری للمؤمنین ﴾ (یہ قرآن) ان پہلی کتابوں (توراۃ وانجیل) کی تصدیق کرتا ہے۔اور ہدایت وخوشخبری ایمانداروں کے لئے ہے۔سورہ فصلت کی آیۃ نمبر 41 میں اس کا وصف 'مجید' مذکور ہے۔﴿ بل ھو قرآن مجید ﴾ بلکہ وہ بزرگی والا قرآن ہے۔سورہ فصلت کی آیۃ نمبر 3 اور 4 میں اس کا وصف 'بشیر' اور 'نذیر' مذکور ہیں۔ہر وصف قرآنِ کریم کے کسی مفہوم سے تعلق رکھتا ہے۔

سوال:۔قرآن اور حدیث نبوی و حدیث قدسی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔الحدیث النبوی، الحدیث لفظی معنی کے لحاظ سے قدیم کی ضد ہے۔قدیم کا معنی پرانا اور حدیث کا معنی جدید اور نیا ہے۔اس سے مراد ہر وہ کلام ہے۔جسے زبان سے بولا جاتا ہے۔ نقل کیا جاتا ہے۔دوسرے انسانوں تک پہنچایا جاتا ہے۔وہ کلام وحی کے ذریعہ سے ہو۔انسان کی بیداری یا نیند کی حالت میں ہو اس لحاظ سے قرآنِ کریم کا نام حدیث بھی ہے۔یہ ذکر سورۃ النساء کی آیۃ نمبر 87 میں ہے۔﴿ ومن اصدق من اللہ حدیثا ﴾ اور بات کرنے میں اللہ سے زیادہ سچا کون ہے؟

☆ اصطلاحی طور پر الحدیث وہ کلام ہے۔جس کی نسبت فعلی، قولی، تقریری یا کسی صفت کی بناء پر نبی ﷺ کے ساتھ کی گئی ہو۔قولی نسبت کی مثال آپ ﷺ کا یہ قول ہے 'انما الاعمال بالنیات' متفق علیہ۔

فعلی حدیث کی نسبت: نبیؐ کا صحابہؓ نے فرمانا' صلوا کما رایتمونی اصلی 'تم اسی طرح نماز پڑھا کرو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

تقریری حدیث کی مثال: نبیؐ نے ایک آدمی کو چھوٹے لشکر کا سردار بنا کر بھیجا وہ انہیں نماز پڑھاتا تھا۔ اور رکعت کی ہر قرآءۃ کے بعد سورۂ اخلاص لازمی پڑھتا تھا۔ ماتحت صحابہؓ نے آ کر رسول اللہؐ سے یہ خبر بیان کی آپؐ نے فرمایا: اس سے پوچھو ایسا کیوں کرتا ہے صحابہؓ نے اس امیر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ سورۂ اخلاص میں رحمان کی عظیم صفات بیان کی گئی ہیں۔ اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ رسول اللہؐ یہ سن کر فرمایا۔ اس سے کہو، اللہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح آپؐ کے دستر خوان پر سانڈھے کا گوشت کھایا گیا آپؐ نے تو نہیں کھایا۔ مگر صحابہ کو منع بھی نہ کیا۔

☆ صفاتی حدیث کی مثال: رسول اللہؐ ہمیشہ خندہ رو (ہنس مکھ) رہتے تھے۔ نرم اخلاق تھے۔ نرم پہلو والے تھے۔ نہ بد خلق تھے۔ نہ سخت خو تھے۔ ان اوصاف کا حامل بھی رسول اللہؐ کا پیروکار شمار ہوتا ہے۔ اور مذکورہ صفات سیرت نبیؐ کا حصہ ہیں۔

سوال: ۔حدیث قدسی کی تعریف اور قرآن وحدیث قدسی کے درمیان فرق کو واضح کیجئے:

الجواب: ۔القدسی ۔القدس کی طرف نسبت ہے۔ التقدیس کا معنی ۔تنزیہ۔ عیب سے بچانا۔ تطہیر اور تعظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 31 میں فرشتوں کا قول بیان کیا ہے ﴿ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک﴾ اور ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں۔ اور تیری پاکبازگی بیان کرتے ہیں۔

☆ اصطلاحی طور پر حدیث قدسی وہ کلام ہے جس کی نسبت نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں ۔یعنی آپؐ روایت کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور رسول اللہؐ اسے اپنے الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی دوسرا راوی بیان کرے تو وہ رسول اللہؐ سے سند کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ رسول اللہؐ اپنے رب سے روایت کرتے ہیں۔ یا یوں کہتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس سے معاملہ کروں گا۔ اور جب وہ دل میں میرا ذکر کرتا ہے۔ تو میں اس کا ذکر اپنے نفس

میں کرتا ہوں۔ اور اگر وہ میرا ذکر شرفاء میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر شرفاء میں کرتا ہوں۔ جو اس کے شرفاء سے بہتر ہیں۔ (یعنی مقرب فرشتے میں) (متفق علیہ)

☆ القرآن اور حدیث قدسی میں فرق: اہم فرق یہ ہے کہ القرآن الکریم اللہ کا کلام ہے۔ جسے اس نے رسول اللہ کی طرف وحی کیا ہے۔ من وعن اپنے الفاظ کیساتھ۔ نہ اس میں رسول اللہ کا کوئی لفظ شامل ہو۔ اور نہ جبریل امین کا کوئی لفظ اس میں داخل ہے۔ اور اسی قرآن کے ذریعے فصحاء عرب کو چیلنج کیا گیا ہے۔ تو وہ اس کیطرح کی ایک بھی سورت پیش کرنے سے عاجز رہے۔ اور یہ قرآن قیامت تک معجزہ ہے۔ مگر حدیث قدسی کے ذریعے کوئی چیلنج نہیں کیا گیا۔ قرآن کریم کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ہے۔ اور حدیث قدسی کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی رسول اللہؐ کے ساتھ ہوتی ہے۔ تب یہ نسبت اخباری ہوتی ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دیتے ہیں۔

تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن پاک پورے کا پورا تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ لہذا وہ قطعی الثبوت ہے۔ اور احادیث قدسیہ کی اکثریت اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔ لہذا وہ ظنی الثبوت ہیں۔ کبھی حدیث قدسی صحیح ہوتی ہے۔ کبھی حسن اور کبھی ضعیف بھی ہوتی ہے۔

چوتھا فرق: قرآن کریم لفظاً اور معناً اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اور حدیث قدسی کا معنیٰ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مگر الفاظ نبیؐ کے ہوتے ہیں۔ لہذا حدیث قدسی وحی بالمعنیٰ ہوتی ہے ۔ وحی باللفظ نہیں ہوتی۔

پانچواں فرق: عبادت نماز وغیرہ میں تلاوت قرآنِ کریم ہی کی ہوتی ہے۔ ﴿ فاقرأوا ما تیسر من القرآن ﴾ سورۃ المزمل آیہ نمبر 20)

قیام اللیل میں اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو (یعنی طویل قرآءۃ کی بجائے ہلکی قرآءۃ کر لیا کرو نبی کریم ﷺ اتنی طویل قرآءۃ کرتے تھے کہ پاؤں سوجھ جاتے تھے اس میں اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی) لہذا قرآن کی تلاوت بھی عبادت ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ ثواب واجر عطا فرماتا ہے۔ الف لام میم پر تیس نیکیاں عطا فرماتا ہے (رواہ الترمذی عن ابن مسعودؓ وقال حدیث حسن صحیح) مگر حدیث قدسی کو نماز میں پڑھا نہیں جا سکتا۔ نہ اس کے نماز میں پڑھنے پر ثواب کا ذکر ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی تلاوت پر ثواب واجر کا ذکر ہے۔

سوال: ۔ حدیث قدسی اور حدیث نبوی کے درمیان فرق پر مختصر نوٹ لکھیے:

الجواب:۔ حدیث نبوی کی دو قسمیں ہیں:

(1) قسم توقیفی:۔ یہ وہ قسم ہے جس کا مضمون نبیؐ نے وحی سے سیکھا پھر لوگوں کے لئے اُسے اپنے کلام سے واضح کیا۔ اس قسم کا مضمون کلام کی حیثیت سے اللہ کے ساتھ ہی منسوب ہوتا ہے۔ مگر اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ اللہ کی طرف کی جاسکتی ہے۔ اس لئے کہ کلام اس کے قائل ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی ومفہوم کو اپنے غیر سے سیکھا ہو۔

(2) دوسری قسم توفیقی ہے۔ اور یہ قسم وہ ہے کہ جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے فہم کے ذریعے قرآن کریم سے اخذ کیا ہو۔ یا اپنے اجتہاد سے قرآن کریم کی وضاحت کی ہو۔ یہ قسم استنباطی اور اجتہادی ہے۔ اگر درست ہو تو وحی اس کی تصدیق وتصویب کر دیتی ہے۔ اگر اس وضاحت میں کوئی جزئی خطا ہو تو اسکی درستی کے لئے وحی نازل ہو جاتی ہے۔ اور یہ قسم کلام اللہ کے زُمرے میں نہیں آتی۔ اس کی مثال بدری قیدیوں کے بارے میں آپ کا اجتہادی فیصلہ تھا۔ کہ ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ یہ فیصلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے رائے سے کیا گیا تھا۔ جس پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی نازل ہوئی۔ جو سورۃ الانفال کی آیۃ نمبر 67 میں ذکر ہے۔ اس آیت نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کردی کہ ان سب قیدیوں کو ان کے رشتہ داروں کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ انہیں قتل کریں۔ آیت میں یہ ذکر ہے۔ کہ نبیؐ کے یہ امر لائق نہیں ہے۔ کہ اس کے پاس (کفار) قیدی ہوں اور وہ ان کا خون بہائے بغیر چھوڑ دے۔ توقیفی قسم حدیث کے بارے بارے میں تو فرمانِ باری ہے ﴿ومَا ینطق عن الھویٰ إن ھو الا وحی یوحیٰ﴾ (النجم) (اللہ کا رسولؐ) اپنی نفسانی خواہش سے کچھ نہیں بولتا۔ جو کچھ وہ بولتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

حدیث قدسی کا مفہوم ومعنی وحی کی کسی کیفیت کے ساتھ رسول اللہؐ کے دل میں ڈالا جاتا ہے۔ مگر الفاظ رسول اللہؐ کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت اس کے مضمون کی ہوتی ہے۔ اگر اس کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تو ان کے ذریعے بھی چیلنج کر دیا جاتا اور قرآنِ کریم کی طرح اسے بھی عبادت میں شامل کر لیا جاتا۔ اس فیصلے پر دو شبہات وارد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ حدیث نبوی بھی وحی بالمعنی ہوتی ہے۔ اور اس کے الفاظ نبیؐ کے ہوتے ہیں۔ پھر اسے حدیث قدسی کیوں نہیں کہا جاتا؟

الجواب:۔ ہم حدیثِ قدسی کے بارے میں نصِ صریح کی وجہ سے حتمی یقین رکھتے ہیں۔ کہ اس کا مفہوم

ومعنی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ احادیثِ النبویہ کبھی توفیقی اور کبھی اجتہادی یہ بہت بڑا فرق ہے۔ حدیث نبوی اور حدیث قدسی میں۔ حدیثِ قدسی کی روایت میں رسول اللہؐ کہتے ہیں۔ قال اللہ او یقول اللہ مگر حدیث نبوی میں وہ یہ الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

دوسرا شبہ: جب حدیث قدسی کے الفاظ بھی رسول اللہؐ کے ہی ہوتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کی جائے؟

الجواب:۔ یہ بات عربی زبان میں عام مشہور ہے۔ کہ کلام کی نسبت اس کے مضمون کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی معنی ومفہوم کسی اور شخص کا ہو اور دوسرا شخص اسی مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کرے۔ تو اسکی نسبت اسی شخص کی طرف کی جاتی ہے جس نے مضمون، معنی اور مفہوم پیش کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے کلام کو ان کے الفاظ کی بجائے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی زبان عربی اور فرعون کی زبان قبطی تھی۔ مگر قرآن میں ان کا بیان عربی میں ہے۔

سوال:۔ وحی کے بارے میں مختصر اور جامع نوٹ لکھئے۔

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے انکار کرنے والے لوگوں کی حالت کو ناپسند کیا ہے۔ ارشاد باری ہے ﴿ اکان للناس عجبا أن أوحينا إلىٰ رجل منهم أن أنذر الناس وبشر الذين آمنوا ان لهم قدم صدق عند ربهم ؟ قال الكافرون ان هذا لساحر مبين ﴾ کہ (منکرین قیامت لوگوں کو) ڈرایئے اور ایمانداروں کو خوشخبری دیجئے۔ کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس اعلیٰ اور سچا درجہ ہے۔ کافروں نے کہا: یقیناً یہ (نبوت کا مدّعی) تو کھلا جادوگر ہے۔ سائنسی تجربات نے واضح کر دیا ہے۔ کہ اس نظر آنے والے جہان کے علاوہ بھی ایک ایسا جہان ہے۔ جو عالمِ مشاہدہ سے زیادہ گہرا اور لطیف ہے۔ نئی نئی ایجادات نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ جو چیز تم اپنے سامنے دیکھتے ہو اس کے پیچھے کوئی اور چیز بھی پوشیدہ ہے۔ جیسے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی چھ ہزار میل دور بیٹھے ہوئے اپنے کسی دوست سے بات کرتا ہے۔ وہ دونوں بالمشافہ ایک دوسرے سے رازکی باتیں کرتے ہیں۔ مگر ساتھ بیٹھنے والوں کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ کہ ان کی آپس میں کیا رازدرانہ گفتگو ہوئی ہے۔ یہی معاملہ وحی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے پاکدامن اور پرہیزگار آدمیوں کو اپنی دوستی کے ساتھ مخصوص کرتا ہے۔ جن کا آئینہء دل اخلاقی آلودگی سے ملوث نہیں ہوتا۔ اور وحی کی قبولیت کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ انہی کو انبیاء و مرسلین کا نام دیا جاتا ہے۔

☆ جسم انسان کی دو کیفیتیں ہیں۔ ایک جسمانی دوسری روحانی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی جسمانی اور نفسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے روئے زمین میں رنگا رنگ کا رزق پیدا کیا ہے۔ جس سے انسانی زندگی قائم رہتی ہے۔ اگر اسے مناسب غذا فراہم نہ ہو تو انسانی زندگی بہت سے مصیبتوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی کا روحانی پہلو ہے۔ اور وہ بھی اس بات کا حق رکھتا ہے۔ کہ اُسے ایسی غذا فراہم کی جائے جس سے وہ مختلف روحانی بیماریوں سے محفوظ رہے۔ اور آخرت کی دائمی زندگی میں امن و اطمینان حاصل کر سکے۔ اللہ نے انسان کی جسمانی بیماریوں کی شفا کے لئے دوائیاں پیدا کی ہیں۔ وہ انسان کے روحانی شعبے میں رہنمائی میں محروم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اُس نے اپنے برگزیدہ انبیاء کے ذریعے جن کا آئینۂ دل انتہاء شفاف اور قبولیتِ وحی کی صلاحیت رکھتا ہے انسان کی روحانی ہدایت کا اہتمام فرمایا ہے۔ (ٹیلویژن کا شیشہ بھی انتہائی صاف ہوتا ہے۔ جس پر ایتھر (اشیر کی لہریں پیچ ہوتی ہیں یہی لہریں آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی ہیں۔ ایتھر فضا میں وہ مادہ ہے۔ جس کی حرکت سے گرمی میں شدت اور تیزی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رسالت کے لئے کسی ایسے آدمی کو منتخب نہیں کرتا۔ جس کی لوحِ قلب اخلاقی رذالتوں سے ملوث ہو۔ جس طرح ایتھر انتہائی شفاف آئینے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی کے لائق بھی وہ شخص ہوتا ہے جس کا آئینۂ دل کسی اخلاقی رذالت سے ملوث نہ ہُوا ہو۔ چنانچہ آخری نبی محمد ﷺ کا دل ہر اخلاقی رذالت سے پاک تھا۔ منکرینِ رسالت چالیس سال تک تو آپ کو صادق و امین کہتے ہیں۔ بچپن میں آپ مجسم شرم و حیا تھے۔ بچوں کے ساتھ کسی ردی کھیل میں شریک نہ ہوئے۔ شراب اور بت پرستی سے مجتنب رہے۔ شرم و حیاء کی مثال وہ واقعہ کافی ہے۔ جب تعمیر کعبہ کے لئے پتھر ڈھوئے جا رہے تھے۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے آپؐ کے نازک کندھے کو خراش سے بچانے کے لئے آپ کا ازار (تہبند) اتار کر آپؐ کے کندھے پر رکھا تو آپؐ بے ہوش ہو گئے۔

☆ جب انسان ٹیلویژن پر ایتھر کے ذریعے ہزاروں میل دور کی خبریں چند سیکنڈز میں سن لیتا ہے۔ اب تو فیکس کی ایجاد سے آدمی اپنا پیغام ایک سیکنڈ میں ہزاروں میل کے فاصلے پر پہنچا دیتا ہے۔ ایتھر کی لہریں بلند و پست زمین اور سمندروں کو عبور کر کے ایسے لوگوں کی خبریں بھی پہنچا

دیتی ہے۔جن کے مرنے کے بعد عرصہ دراز گزر چکا ہوتا ہے۔لہروں میں آئی ہوئی ان خبروں کی آواز نہیں سنی جاسکتی اور نہ لہروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔اس میں راز یہ ہے کہ ٹی وی کی سکرین (شیشے) میں ایسی صفائی ہے جس پر ان لہروں کا نزول ہو سکتا ہے۔اسی طرح انبیاء کے دل کا شیشہ اتنا شفاف ہوتا ہے۔کہ اس پر وحی کا نزول ممکن ہے۔جن لوگوں کے دل کا شیشہ خباثت اور برائیوں سے سیاہ ہو چکا ہوتا ہے۔وہی وحی کے نزول کا انکار کرتے ہیں۔اور مطالبہ کرتے ہیں۔کہ ہمیں بھی وحی کے ذریعے بتایا جائے کہ محمد ﷺ برحق نبی ہیں۔مشرک کو بتوں کی محبت نے اندھا کر دیا ہوتا ہے۔اس لئے وہ صحیح فیصلہ کرنے سے عاری ہوتے ہیں۔چالیس سال کی عمر تک تو ایک شخص کو صادق اور امین کہتے ہیں۔بلکہ 53 سال کی عمر تک اس کے پاس امانتیں رکھتے ہیں۔دعویٰ نبوت کے بعد یکا یک اُسے شاعر، ساحر، مجنون اور کاہن کا لقب دیتے ہیں۔یہ فتور عقل کا کرشمہ ہے۔وہ یہ جانتے ہیں کہ شاعر، ساحر اور کاہن دولت کے طالب ہوتے ہیں۔مگر جسے وہ ان صفات سے متصف کرتے ہیں۔وہ ان کی ڈھیروں دولت کی پیشکش کو ٹھکرا دیتا ہے۔نیز مجنون اور پاگل آدمی کے پاس کونسا عقل مند اپنی امانت رکھتا ہے؟ مذکورہ سائنسی ایجادات نے وحی کی بھرپور تائید کر دی ہے۔اگر اب بھی کوئی وحی کا انکار کرتا ہے تو اس کا اصل ٹھکانہ مینٹل ہسپتال (پاگل خانہ) ہے۔

عام عقل مند انسانوں کے ساتھ رہنے کا اُسے کوئی حق نہیں ہے۔نزولِ وحی کو صحابہ کرام نے دیکھا ہے۔اور تواتر کے ساتھ اسے نقل کیا ہے۔جب تک کوئی امت وحی کی رہنمائی کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔وہ دنیا میں باعزت رہتی ہے۔اور جب وہ وحی کے دامن کو چھوڑ دیتی ہے۔تو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے۔موجودہ دور میں امتِ مسلمہ کی پستی او رذلت کا سبب بھی وحی کی پیروی سے بیزاری ہی ہے۔آج بھی صدائے فطرت پکارتی ہے۔

ہے تیرے پاس نسخہ تسخیر کائنات : کیوں ذلت و ادبار کا ہے سامنا تجھے؟

محمد ﷺ کی طرح اللہ تعالی نے پہلے (رحمانی) رسولوں کیطرف بھی وحی کی تھی۔﴿انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح الخ﴾

☆ وحی کا معنی تیز اشارہ بھی ہے۔کبھی آواز کے ذریعے اور کبھی کسی عضو کے ذریعہ اشارہ ہوتا ہے۔لفظی معنی کے چند پہلو: (1) انسان کے دل میں کبھی ایسا خیال پیدا ہوتا ہے۔جس پر عمل کے ذریعے وہ تیار ہو جاتا ہے۔اسے فطری الہام کہا جاتا ہے۔جیسے ام موسیٰ کی طرف وحی

ہوئی ﴿واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیه الخ﴾

(2) حیوان کا طبعی الہام: اللہ نے حیوان کی پیدائش کے وقت ہی سے اس کی طبیعت میں یہ الہام پیدا کر دیا ہے۔ جیسے شہد کی مکھیوں کیطرف وحی کا ہونا۔ کہ وہ پھولوں کے رس چوس کر ایک خاص ترکیب سے چھتہ بنا کر شہد کی صورت میں جمع کریں۔

(3) تیز اشارے کے ساتھ کلام کرنا۔ جیسے ذکریا علیہ السلام نے اشارے سے کلام کیا تھا۔ قرآن نے اسے بیان کیا۔ ﴿فخرج علی قومه من المحراب فاوحیٰ الیهم ان سبحوا بکرۃ وعشیا﴾

(4) انسان کے دل میں شیطان کا وسوسہ کے ذریعے برائی کو آراستہ کرنا۔ ﴿ان الشیاطین لیوحون الیٰ اولیآئهم الخ﴾ (سورۃ الانعام)

(5) اللہ تعالیٰ کا اپنے فرشتوں کو کسی کام کی وحی کرنا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی طرف شریعت کی وحی کرتا ہے۔ یہ ایسی چیز کا علم ہے۔ جسے نبی یقین کے ساتھ اپنے دل میں پاتا ہے۔ کہ یہ اللہ کی طرف سے بلا واسطہ یا بالواسطہ نازل کیا ہوا علم ہے۔ بلاواسطہ وحی تو آواز کے ساتھ ہوتی ہے۔ جسے آدمی کے کان سنتے ہیں۔ یا بغیر آواز کے ہوتی ہے اور اسے الہام کہا جاتا ہے۔ وحی اور الہام کے درمیان فرق یہ ہے کہ "ہام ایسی بے آواز کیفیت ہے جس پر آدمی کا دل یقین کرلے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ الہام کس کیطرف سے ہے۔ یہی کیفیت بھوک پیاس خوشی اور غم کی کیفیت کے ساتھ مل جلتی ہے۔

☆ کیفیۃ وحی اللہ الی الملائکۃ.

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو مختلف امور انجام دینے کا حکم دیتا ہے۔

تو وہ اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ کلام کے بغیر ایسے انداز میں بات کرتا ہے۔ کہ وہ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ فرمانِ رسولؐ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی معاملہ کی فرشتوں کی طرف وحی کرے۔ تو اس انداز سے وحی کرتا ہے۔ کہ آسمانوں میں شدید لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس سے لرزہ سے تمام فرشتے بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلے جبریل امین سر اٹھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنے ارادے کی وحی کرتا ہے۔ پھر جبریل جب کسی آسمان کے پاس سے گذرتا ہے تو فرشتے پوچھتے ہیں۔ کہ ہمارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ جبریل کہتا ہے کہ اس نے حق فرمایا ہے۔ اور وہ بہت بلند و برتر ہے۔ سب فرشتے

بھی یہی بات کہتے ہیں۔ پھر جبریل امین وہ وحی لے کر وہاں تک پہنچتا ہے جہاں تک پہنچنے کا اسے حکم ہوتا ہے۔ جب اللہ آسمان میں کسی امر کا کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ تو فرشتے عاجزی کرتے ہوئے اپنے پر اس طرح پھڑ پھڑاتے ہیں۔ جیسے کسی سخت پتھر پر زنجیر کو مارا جاتا ہے۔

☆ جاہل لوگوں نے قرآنی وحی کے بارے میں یہ دعوی کیا ہے۔ کہ محمد ﷺ بہت ذہین تھے۔ قرآنی وحی کے الفاظ اس نے خود وضع کر لیے ہیں۔ اس دعویٰ کا اک جواب تو یہ ہے کہ آپؐ بالکل اُمّی (ان پڑھ) تھے اگر یہ الزام صحیح ہے۔ تو بتائیں کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھا گیا اور منافقین کی افواہ بازی کے ساتھ کچھ مومن مِسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت، اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنھم نے بھی اپنی آواز ملا دی۔ نبیؐ ایک ماہ تک پریشان و مضطرب رہے۔ وحی نے تاخیر کی۔ پھر عائشہؓ کے بارے میں دس آیات برءیت نازل ہوئیں۔ پھر آپؐ نے مذکورہ مومنین پر حدِ قذف اسّی اسّی کوڑے نافذ کی۔ یہ المناک انتظار کیوں آپ کو کرنا پڑا؟ اسی طرح غزوہ تبوک کی تیاری کے وقت منافقین جھوٹے بہانوں سے رخصت لیتے گئے۔ مگر تین اصحاب کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع نے کوئی عذر پیش نہ کیا یونہی سستی کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ نبیؐ اور پورا اسلامی معاشرہ ان سے بائیکاٹ کرتا ہے۔ وحی میں تاخیر ہوئی۔ تقریباً پچاس دنوں کے بعد ان کے بارے میں آیات توبہ کا نزول ہوا۔ اگر قرآنی وحی آپ کی ذہانت ہی کا کرشمہ تھا۔ تو اتنا عرصہ المناک انتظار کی کیا ضرورت تھی۔

☆ تیسرا جواب یہ ہے۔ کہ اہل عرب میں ذکاوت اور ذہانت کی کیا کمی تھی جب قرآنی وحی نے انہیں چیلنج کیا تو وہ اس کا جواب کیوں نہ دے سکے؟ یہ تو کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی مثال ہے۔ جب کوئی ضدی صحیح جواب سے عاجز آ جاتا ہے۔ تو وہ ایسی ہی بکواس اور درفشانی ہانکتا ہے اور اندھیرے میں لاٹھی چلاتا ہے۔

سوال:۔ نزولِ قرآن کریم کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔ ثابت ہوا ہے کہ قرآن کریم لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ ﴿بل هو قرآن مجيد ، في لوح محفوظ﴾ (البقرہ آیات 21،22) بلکہ وہ قرآن بزرگ ہے۔ لوح محفوظ میں ہے۔ پورے قرآن کا نزول بیت العزۃ سے آسمانِ دنیا میں ماہِ رمضان المبارک کی لیلۃ القدر میں ہوا ہے۔ ﴿انا انزلناه في ليلة القدر﴾ ﴿انا انزلناه في ليلة القدر﴾ (الدخان

3: لیلۃ مبارکۃ سے مراد بھی لیلۃ القدر ہی ہے۔ جو روایات اسے شعبان کی پندرھویں رات سے منسوب کرتی ہیں۔ وہ سب ضعیف ہیں۔ بیت العزۃ سے آسمان دنیا پر تو لیلۃ القدر ایک ہی رات میں پورے کا پورا نازل ہوا پھر جبریل امین کے ذریعے حسب حالات تھوڑا تھوڑا کر کے بیس سالوں میں رسول اللہ ﷺ کے دل پر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد باری ہے۔ ﴿وقرآناً فرقناه لتقرأ على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا﴾ اور قرآن کو ہم نے جدا جدا (نازل) کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر اس کی تلاوت کریں اور ہم نے اسے (حسب ضرورت) تھوڑا تھوڑا نازل کیا ہے۔ جبریل امین کی طرف وحی کی کیفیت:

(۱) جبریل امین اللہ تعالیٰ کے خاص الفاظ ہی سن کر نبی صلعم تک پہنچاتے رہے۔

(۲) جبریل امین لوح محفوظ سے قرآن کو یاد کر کے نبی تک پہنچاتے رہے۔

(۳) جبریل امین تک قرآن کا مفہوم پہنچایا گیا اور الفاظ جبریل امین یا محمد صلعم کے تھے۔ پہلی ایک صورت ہی صحیح ہے۔

اور ﴿انه لقول رسول كريم﴾ آیت میں جو قرآن کریم کو رسول کریم کا قول کہا گیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول کریم کا قول بھی انہی الفاظ پر مشتمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ دراصل کیفیت نمبر 2 اور نمبر 3 صحیح نہیں ہے۔ بلکہ کیفیت نمبر 1 درست ہے۔ ورنہ اہل انکار کے الزام کی تائید ہو جائے گی۔ جو قرآن کریم کو جبریل امین اور محمد صلعم کا وضع کردہ کلام کہتے ہیں۔ حضرت نواس ؓ کی حدیث واضح کرتی ہے۔ اکثر آیات میں قرآن کی نسبت اللہ کے ساتھ کی گئی ہے۔ سورۃ النحل کی آیت نمبر 4 میں ارشاد ربانی ہے۔ ﴿وانك لتلقى القرآن من لدن حكيم عليم﴾ لہذا قرآن کریم اللہ تعالیٰ ہی کے الفاظ کے ساتھ اللہ کا کلام ہے۔ جبریل امین یا محمد ﷺ کا کلام نہیں ہے۔

دوسری اور تیسری کیفیت کی قرآن وسنت میں تائید نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ جو نبی کی طرف وحی کی جاتی تھی اُسے نبی ﷺ اپنے الفاظ کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اسی وحی کے بارے میں سورۃ النجم کی یہ آیت ہے۔

﴿وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحي يوحى﴾ یعنی قرآنی وحی کے علاوہ جو بھی نبی ﷺ بولتے ہیں وہ بھی وحی ہوتی ہے۔ جو اس کی وحی بھیجی جاتی ہے۔ لہذا احادیث کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ مگر قرآن کے مفہوم کو کوئی شخص اپنے الفاظ میں تبدیل کر کے یہ نہیں کہہ سکتا

کہ یہ قرآن ہی کے الفاظ ہیں جس طرح توراۃ کے یہودی عالم اپنے ہاتھوں سے اپنی مرضی کے مسائل لکھ کر یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ توراۃ ہی کے الفاظ ہیں اس طرح وہ فتویٰ فروشی سے دولت حاصل کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں نبیؐ پر نیند کی حالت میں سچے خوابوں سے وحی کی ابتداء کی گئی تھی۔ یہ صورت رسول اللہ کو تیار کرنے کے لئے ہوتی تھی۔ تاکہ بیداری کی حالت میں آپ پر وحی نازل کی جائے۔ قرآن کی وحی کبھی نیند کی حالت میں نہیں کی گئی۔ بلکہ قرآن پورے کا پورا بیداری کی حالت میں وحی کیا گیا ہے۔

یہ دلیل اس شخص کا رد کرتی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ سورۂ کوثر نیند کی حالت میں نازل ہوئی ہے۔ اسے مسلم کی حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ کہ ایک دن رسول اللہ صلعم مسجد میں ہمارے ساتھ بیٹھے تھے۔ اچانک آپؐ پر کچھ مدہوشی طاری ہوئی۔ پھر آپؐ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کو کس چیز نے ہنسایا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے ﴿انا اعطیناک الکوثر فصلّ لربک وانحر ان شانئک هو الابتر﴾ مدہوشی ایسی حالت ہے جو وحی نازل ہونے کی صورت میں آپ پر طاری ہوتی تھی۔ نیند کی حالت میں نبیوں کے اچھے خواب بھی وحی ہوتے ہیں اور ان کی پیروی کرنا بھی واجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو خواب میں ذبح کرتے دیکھا تھا۔ ﴿فلما بلغ معه السعي قال يا بنيّ اني ارىٰ في المنام اني اذبحك فانظر ما ذا ترىٰ قال يا ابت افعل ما تؤمر ستجدني ان شآء الله من الصابرين﴾ ابراہیم علیہ السلام اس خواب کی پیروی میں اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لئے منیٰ میں لے گئے تھے۔ اگر وہ وحی کی حیثیت نہ رکھتا تو خلیل اللہ بیٹے کو ذبح کرنے کا قصد نہ کرتے۔ وحی کا سلسلہ رسول اللہ کی وفات کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اور خوشخبری دینے والی کیفیتیں باقی ہیں۔ اور وہ ایمانداروں کے سچے خواب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی بشر ہم کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا اللہ تعالیٰ کسی فرشتے کو بھیجتا ہے۔ تو وہ اللہ کی مشیت سے وحی کرتا ہے۔ بیشک وہ بلند اور حکمت والا ہے۔ (الشوریٰ) بیداری کی حالت میں پردے کے پیچھے سے اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنا ثابت ہے۔ اسی طرح رسول اللہؐ کے ساتھ بھی معراج کی رات میں پردے کے پیچھے سے کلام کرنا ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنی رسالت کے لئے چن لیتا ہے۔ اور وہ اسی بندے کو اپنی رسالت کے لئے منتخب کرتا ہے جس کا آئینہ دل ہر طرح کی اخلاقی برائی سے پاک ہوتا ہے۔ عقل کے غلام لوگوں کا خیال ہے کہ ایک یتیم بچہ جس قوم میں پروان چڑھتا ہے اسی کے اخلاق سے متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ ان پڑھ ہونے کے باوجود اہل عرب میں شاعر، کاہن اور فصیح وبلیغ لوگ موجود تھے اس لئے وہ نبی ﷺ کو بھی انہی صفات سے متصف کہتے تھے۔ حالانکہ آپ بچپن ہی سے اخلاقی رذالتوں سے مبرا تھے۔

متکلمین کی گمراہیاں۔

متکلمین ان عقل کے اندھے فلسفیوں کو کہتے ہیں جو ہدایت الٰہی کی بجائے چیزوں کی حقیقت جاننے کے لئے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے اور ٹامک ٹومیاں مارتے ہیں۔ تاہم چیزوں کی حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ ان سے متعلق کئی ایک لطیفے مشہور ہیں۔ ایک فلسفی نے ایک طویل مینار دیکھ کر یہ خیال کیا۔ کہ یہ مینار پہلے زمین پر سیدھا بنایا گیا ہوگا۔ پھر اسے کھڑا کر دیا گیا ہوگا۔ ایک فلسفی نے کسی اونچی دیوار پر گوبر کے اُپلے لگے ہوئے دیکھے تو گھر والوں سے پوچھا۔ مجھے وہ بھینس دکھاؤ جو تمہاری بیس پچیس فٹ اونچی دیوار پر گوبر کرتی ہیں؟ ان عقل کے اندھوں نے اللہ کے کلام کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک نفسی کلام ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے۔ یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں نہ کوئی حرف ہے نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی ترتیل ہے۔

دوسری قسم لفظی کلام کی ہے۔ اور وہ کلام نبیوں پر اتارا گیا ہے۔ اور اس قسم میں چار کتابیں اتری ہیں۔ علماءِ کلام نے اپنی بدعت کلام میں بہت مبالغہ کیا ہے۔ انہی کی گمراہی سے بہتر گمراہ فرقے وجود میں آئے تھے۔

سوال:۔ مکی اور مدنی آیات کی معرفت پر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔ تمام امتیں اپنی نظریاتی وراثت کی حفاظت اور اپنی تہذیب وتمدن کو قائم رکھنے والے اسباب کی حفاظت کا بہت زیادہ اہتمام کرتی ہیں۔ امتِ مسلمہ رسالتِ محمدیہ کی وراثت کی حفاظت میں ان تمام امتوں سے آگے بڑھ گئی ہے۔ اس امر کا اعتراف اہلِ کفر کے سکالرز ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہ امتِ مسلمہ کے نزدیک اپنے نبی کی سیرت اور رسالت عام علوم وفنون کی حیثیت نہیں رکھتی۔ بلکہ رسالتِ محمدیہ تو انسانیت کی نظری اور اصلاحی بنیادوں سے بہت

اونچا درجہ رکھتی ہے۔ہم صحابہ وتابعین اوران کے بعد آنے والے ہدایت کے پہاڑوں کو اس طرح پاتے ہیں کہ قرآن کی منزلوں کو ایک ایک آیت پڑھ کر ضبط اور محفوظ کرتے تھے۔اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ آیت کس وقت اور کس مقام پر نازل ہوئی ہے۔ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے، اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔اللہ کی کتاب کی جو سورۃ بھی نازل ہوئی ہے۔میں جانتا ہوں کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ اگر میں جان لوں کہ کتاب اللہ کا کوئی مجھ سے زیادہ عالم ہے۔اور وہاں تک اونٹ پہنچ سکتے ہیں تو میں اس کی طرف ضرور سواری لے جاؤں (بخاری)

شریعت کے فرائض پر عمل کی تکلیف دینے سے پہلے توحید ورسالت کے ذریعے انسانوں کا عقیدہ صاف کیا گیا تھا۔اس کے بعد انفرادی اوراجتماعی احکام پر عمل کرنے کی تکلیف دی گئی ہے۔جو شخص قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھتا ہے۔وہ مکی آیات میں ایسی خصوصیات پاتا ہے۔جو مدنی آیات میں نہیں پائی جاتیں۔جب لوگ ایسی جاہلیت میں تھے جو انہیں حق کے بارے میں اندھا بہرہ کر چکی تھی۔بدلے کے دن کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے، جب ہم مر کر مٹی ہوگئے تو کیا ہمیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ (یہ تو ناممکن ہے) اپنی فصاحت وبلاغت کی وجہ سے سخت جھگڑا کرتے تھے۔اس حالت کی اصلاح کے لئے مکی آیات نازل ہوئیں جن میں انہیں سخت ڈانٹ ڈپٹ کی گئی۔اور ایسے لاجواب کرنے والے دلائل دیئے گئے جنہوں نے ان کے باطل عقیدے کے بت خانے کو پاش پاش کر دیا۔وہ دلائل انہیں اللہ کی توحید کی طرف دعوت دیتے تھے۔ان دلائل نے ان کے فسادِ عقیدہ کے پردوں کو پھاڑ دیا تھا۔نبوت کے واضح دلائل پیش کئے تھے۔آخرت کی زندگی میں جنت اور جہنم کی مثالیں بیان کی گئی تھیں۔ان کی فصاحت وبلاغت کے باوجود انہیں چیلنج کیا گیا تھا کہ قرآن کے مقابلے میں دس آیات تو پیش کر کے دکھاؤ۔قرآن ان کے سامنے گذشتہ باطل پرست قوموں کا انجام بیان کرتا تھا۔آپ قرآنِ کریم کی مکی حصے میں ایسے الفاظ ڈانٹنے والے کھٹکھٹانے والے چھا جانے والے ہیں سورتوں کے درمیان میں چیلنج کی آیات ہیں۔پہلی شریر امتوں کا انجام ہے۔کائناتی دلائل کا ان میں ذکر ہے۔عقلی دلائل سے انہیں جھنجوڑا گیا ہے۔یہ سب خصوصیتیں ہمیں مکی قرآن میں ملتی ہیں۔تاکہ ان کے فسادِ عقیدہ کا ازالہ کر کے انہیں فرائض شریعت پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔جب اس طرح ایک جماعت تشکیل پا گئی۔اور

اس جماعت نے مشرکین کی ایذا رسانی پر صبر و ثبات اور استقلال کا امتحان پاس کر لیا تو انہوں نے تمام دنیوی رشتوں پر دین کی حفاظت کے لئے ہجرت کو ترجیح دی۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ مدنی آیات میں لمبی عبارتیں ہیں جو اسلام کی حدود و احکام پر مشتمل ہیں۔ اور وہ جہاد و شہادت فی سبیل اللہ کی دعوت دیتی ہیں۔ یہاں شرعی قانون سازی کا آغاز ہوتا ہے۔ مدنی آیات معاشرے کے قواعد وضع کرتی ہی اں۔ خاندانی افراد کی ذمہ داریاں مقرر کرتی ہیں۔ نیز بین الاقوامی تعلقات (Inter ratioal relations) وضع کرتی ہیں۔ منافقین کی نیت کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ اہل کتاب سے مخاصمہ (جھگڑا) کرتی ہیں۔ مدنی قرآن کا یہ عام انداز ہے۔ مکی آیات میں یہ انداز نہیں ہے۔

سوال:۔ مکی اور مدنی آیات پر علماء کے تبصرے اور مثالیں احاطۂ تحریر میں لائیے۔

الجواب:۔ علماء نے قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ کی ترتیب ان کے نزول کے امر میں بہت زیادہ محنت اور جستجو کی ہے۔ اس بارے میں انہوں نے زمانے، مقام اور خطاب کا لحاظ رکھا ہے۔ مقام و خطاب میں انہوں نے مناسبت اور مطابقت بھی قائم کی ہے۔ جس سے مکی اور مدنی آیات کے بارے میں علمی تحقیق کرنے والے کے لئے بہترین مدد موجود ہے۔ یہ بہت بڑی محنت ہے۔ اس سے نزول قرآن کا وقت اور مقام متعین کرنے کی سہولت پائی جاتی ہے۔ مکی اور مدنی آیات کے انداز بیان سے مفسر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سورت اور آیت کس موضوع پر مشتمل ہے؟ آیا یہ اصلاح عقیدہ کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے یا شرعی فرائض واحکام سے؟ جب دلائل کی کثرت کی بناء پر کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تو اپنے فہم و فراست سے ترجیح قائم کرتا ہے۔ پھر بعض کو مکی اور بعض آیات کو مدنی قرار دیتا ہے۔ اور جب آیات سے کسی خاص مقام والے لوگ اس کے حکم سے باخبر ہو جائیں۔ اس صورت کو علماء اس طرح بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ آیت ہے۔ جو مکہ سے لیکر مدینے میں پہنچا دی گئی۔ ابوالقاسم حسن بن محمد بن حکیم نیشاپوری اپنی کتاب، التنبیہ علی فضل علوم القرآن، میں لکھتے ہیں۔ جس شخص نے قرآنی علوم میں اچھی طرح غور و فکر کیا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اس کا حکم اہل مدینہ پر بھی نافذ ہے۔ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کے حکم اہل مکہ کو بھی شامل ہیں۔ یہ مدنی آیت مکہ میں نازل ہونے والی آیت کے مشابہت رکھتی۔ یہ آیت طائف میں یہ آیت جحفہ میں یہ آیت بیت المقدس میں نازل ہوئی مگر ان کا حکم تمام

لوگوں پر نافذ ہے۔ جو رات میں نازل ہوئی اور جو دن میں نازل ہوئی۔ آیت کا انداز بیان خود ہی رہنمائی کر دیتا ہے۔ کہ اس کا حکم عام ہے یا خاص ہے؟ اسی طرح جو آیات اکٹھی نازل ہوئیں۔ جیسے سورۃ الفاتحہ، اور سورۃ الانعام ان کی آیات اکٹھی نازل ہوئی ہیں۔ سورتوں میں جو مدنی آیات ہیں وہ مکہ سے لے کر مدنی سورتوں سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ اور جو آیات مدنی سورتوں میں مکہ سے تعلق رکھتی تھیں انہیں مکی آیات کہہ دیا گیا۔ کچھ آیات مدینہ سے لے کر حبشہ تک پہنچائی گئیں۔ کچھ آیات مجمل اور کچھ آیات مفصل نازل کی گئیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیات مکی ہیں بعض نے کہا یہ آیات مدنی ہیں۔ یہ اختلاف فہم وعقول کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ بہر حال صحیح اجتہاد پر دوہرا اجر اور غیر صحیح اجتہاد پر ایک اجر تو ان علماء کو ضرور حاصل ہوگا۔ کہ ان کی نیت خالص تھی۔ اختلافی عنوان پچیس ہیں۔

جو شخص ان میں امتیاز پیدا نہ کر سکے۔ اس کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اور کے کلام میں کوئی بات کرے۔ علماء نے اس بارے میں بہت باریک بینی سے کام لیا ہے۔ لہذا انہوں نے سورتوں کو ان کے نازل ہونے کے وقت ومقام کے لحاظ سے ایک سورت کو دوسری سورت کے بعد ترتیب دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ سورت فلاں سورت کے بعد نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے بڑی محنت کے بعد سفر وحضر میں نازل ہونے والی آیات میں فرق کیا ہے۔ قرآن کریم میں نوح علیہ السلام کا قصہ ہے۔ کہ انہوں نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم پر توحید ورسالت کی دعوت پیش کی۔ مگر ان کے کفر وشرک پر اصرار کی وجہ سے انہیں طوفان نوح میں غرق کر دیا گیا۔ اس طوفان بارش اور المناک سیلاب سے اہل عرب باخبر تھے۔ اسی طرح اصحاب کہف کا قصہ بھی انہیں سینہ بہ سینہ یاد تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود محمد ﷺ نے یہ تاریخی حقائق کیسے بیان کر دیئے۔ جو ان پڑھ امت میں پروان چڑھے تھے۔ جو لکھنا جانتی تھی اور نہ پڑھنا۔ چالیس سال کی عمر سے پہلے تو اس نے کوئی تاریخی تبصرہ نہیں کیا۔ چالیس سال کی عمر تک تو اس پر جھوٹ کا الزام تھا اور نہ وعدہ اخلاقی خیانت کا بہتان تھا۔ پھر اچانک اس نے مسلمہ تاریخی حقائق کہاں سے حاصل کئے۔ اپنی عقل سے کام لینے والوں کو ماننا پڑے گا۔ ﴿ان ھو الا وحی یوحی: ۴ النجم﴾ کہ جو کچھ اس کی زبان سے صادر ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے وحی کردہ ہوتا ہے۔ اخروی زندگی، جنت اور اس کی نعمتیں جہنم اور اس کا عذاب، فرشتے اور ان کی ذمہ داریاں یہ سب ایسے حقائق ہیں جن کی خبر دینے میں ذکاوت، ذہانت

اور فطانت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کی اکثر پیشگوئیاں جو سو فیصد صحیح ثابت ہوئیں۔ مثلاً اسلام غالب آئیگا تو امن وسلامتی کا ایسا دور دورہ ہوگا کہ ایک زیور سے آراستہ خاتون حیرہ سے تنہا سفر کریگی اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چور ڈاکو کا خوف نہ ہوگا۔ اتنا مالی فیضان ہوگا کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ہوگا۔ اور مسلمانوں کے قبضے میں قیصر وکسریٰ کے خزانے آئیں گے۔ یہ بہت پیشگوئیاں امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی خلافت تک پوری ہوگئیں۔ قیصر وکسریٰ کے خزانوں کے بارے میں پیشگوئی آپؐ نے غزوۂ خندق کے موقعہ پر کی تھی۔ جب بھوک کیوجہ سے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے ایک پتھر کو توڑتے ہوئے جب چنگاریاں اڑیں۔ روشنی ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: مجھے قیصر وکسریٰ کے خزانے دکھائے گئے ہیں۔ منافقین نے اس پر طنز واستہزاء کیا تھا۔ کھانے کو روٹی میسر نہیں اور قیصر وکسریٰ کے خزانوں کے خواب دیکھے جارہے ہیں۔ اسی طرح قرآنی وحی میں مذکور ہے کہ اللہ نے نیک ایمانداروں سے خلافتِ ارضی کا وعدہ کررکھا ہے۔ پھر ان کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر ہے۔ کہ وہ برائیوں کو روکتے اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں۔ یہ وعدہ بھی پورا ہوکر رہا۔ اسی طرح جو دو شخص آپؐ کے پاس اپنا مقدمہ لے کر آئے۔ ان سے فرمایا: ممکن ہے تم میں سے ایک شخص چرب زبان ہو دوسرے مخالف کی بنسبت زیادہ اچھے طریق سے اپنا موقف بیان کردے اور میں اُسے سچا سمجھ کر اس کے حق میں فیصلہ کردوں۔ اگر اس فیصلے میں کسی مسلم کا حق مارا جاتا ہو تو وہ حق (مال) جہنم کا ٹکڑا ہوگا۔ سو وہ (چرب زبان) اُسے لے لے یا چھوڑ دے (متفق علیہ) اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ آپؐ ہر فیصلے میں وحی کے پابند تھے اور آپ غیب کا علم نہ رکھتے تھے۔ آج کل کے ملحدین (بے دین) اس حدیث سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ کو کوئی انسان تعلیم دیتا تھا۔ اعلانِ نبوت سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے آپ کی ملاقات ورقہ بن نوفل سے کرائی تو ورقہ نے آپؐ کے چہرے میں نبوت کی نشانی پائی تو فرمایا کہ یہ جوان عنقریب نبی ہونے والا ہے۔ بچپن کے تجارتی سفر کے دوران بحیرہ راہب نے بصریٰ (شام) کی منڈی میں آپ کو دیکھا، تو کہا! یہ لڑکا نبی ہونے والا ہے۔ ہجرت کے بعد یہود ونصاریٰ کے علماء سے آپ کی ملاقاتیں اور مناظرے ہوئے مگر تاریخ کے کسی حصے میں ثابت نہیں ہے کہ آپ کو کسی نے کچھ پڑھایا لکھوایا ہو۔

سوال:۔ مکی اور مدنی قرآن کے بارے میں علماء کونسی اہم قسمیں بیان کرتے ہیں۔

الجواب:۔علماء درج ذیل اہم قسمیں بیان کرتے ہیں۔

(1) جو قرآن مکہ میں نازل ہوا۔
(2) جو مدینہ میں نازل ہوا۔
(3) جس میں اختلاف کیا گیا۔
(4) مکی آیات مدنی سورتوں میں۔
(5) مدنی آیات مکی سورتوں میں۔
(6) جو مکہ میں نازل ہوا اور اسکا حکم مدنی ہے۔
(7) جو مدینہ میں نازل ہوا اور اس کا حکم مکی ہے۔
(8) جو مکی قرآن مدنی قرآن کے مشابہ ہے۔
(9) جو مدنی قرآن مکی قرآن کے مشابہ ہے۔
(10) جو قرآن مکہ میں نازل ہوا پھر اُسے مدینہ میں لایا گیا۔
(11) جو قرآن مدینہ میں نازل ہوا پھر اُسے مکہ میں لایا گیا۔
(12) جو رات کو نازل ہوا اور جو دن کو نازل ہوا۔
(13) جو موسم گرما میں نازل ہوا اور جو سرما میں نازل ہوا۔
(14) جو حضر (مدینہ میں قیام کی صورت) میں نازل ہوا اور جو مدینہ سے باہر سفر کی حالت میں نازل ہوا۔

یہ بنیادی انواع ہیں۔ مکی اور مدنی قرآن کا یہی محور ہیں۔ اس لئے اس کا نام مکی و مدنی قرآن رکھا گیا ہے۔ صحیح طور پر نمبر 1، 2، 3۔ مکی سورتوں کی تعداد میں داخل ہیں۔

مدنی سورتیں بیس ہیں۔

(1) البقرہ (2) آل عمران (3) النساء (4) المائدۃ (5) الانفال (6) التوبۃ (7) النور (8) الاحزاب (9) محمد (10) الفتح (11) الحجرات (12) الحدید (13) المجادلۃ (14) الحشر (15) الممتحنۃ (16) الجمعۃ (17) المنافقون (18) الطلاق (19) التحریم (20) النصر۔

جن سورتوں میں اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ بارہ ہیں۔

(1) الفاتحۃ (2) الرعد (3) الرحمان (4) الصف (5) التغابن (6) التطفیف (7)

القدر(8) البینہ (9) الزلزلۃ (10) الاخلاص (11) الفلق (12) الناس ۔ مذکورہ بالا سورتوں کے علاوہ بیاسی (82) سورتیں مکی ہیں ۔ اس طرح کل سورتیں ایک سو چودہ (114) ہوئیں۔

☆ مکی آیات مدنی سورتوں میں کبھی مکی سورتوں میں مدنی آیات ہوتی ہیں ۔ اسی طرح مدنی سورتوں میں مکی آیات ہوتی ہیں ۔ یہ سورتیں پوری کی پوری مکی یا مدنی نہیں ہوتیں ۔ مگر ان میں مکی یا مدنی آیات کی کثرت کی وجہ سے مکی یا مدنی کہا گیا ہے ۔ مدنی سورۃ میں مکی آیت کی ایک مثال سورۃ الانفال جو مدینہ میں نازل ہوئی اس کی آیت نمبر 64 مکی ہے ۔ ﴿یا ایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المؤمنین ﴾ اے نبی آپ ؐ کے لئے اللہ ہی کافی ہے ۔ اور وہ ایماندار لوگ جو آپ ؐ کے پیروکار ہیں ۔ وہ بھی آپ ؐ کے لئے کافی ہیں ۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضرت عمر ابن الخطاب نے اپنے مسلم ہونے کا اعلان کیا تھا۔

☆ مکی سورۃ میں مدنی آیت کی ایک مثال ۔ سورۃ الحج مکی ہے ۔ تین آیات مدنی ہیں ۔ جو غزوۂ بدر کے موقعہ پر نازل ہوئی ہیں ۔ جب تین آدمی کفار کی طرف سے اور تین آدمی صحابہ ؓ کی طرف سے لڑائی کے لئے نکلے تھے ۔ (ھذان خصمان اختصموا فی ربھم آیات نمبر 17، 18، 19) یہ دونوں مخالف گروپ اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں ۔ (کافر فریق بہت سے معبودوں کا عقیدہ رکھتا ہے اور مومن فریق ایک ہی معبود کا عقیدہ رکھتا ہے ۔ اسی جھگڑے پر ان کا ٹکراؤ اور لڑائی ہے ۔ مومن فریق نے کافر فریق کو بہت جلد جہنم میں پہنچا دیا تھا)

☆ مکہ میں نزول اور مدنی حکم کی مثال : سورۃ الحجرٰت کی آیت نمبر 13 ہے ۔ جو فتح مکہ کے وقت مکہ میں نازل ہوئی مگر اسے مدنی کہا گیا ہے ۔ اس لئے کہ یہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے ۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد (آدم علیہ السلام) اور ایک عورت (حوا علیہا السلام) سے پیدا کیا ہے ۔ اور تمہیں مختلف قومیں اور قبائل بنایا ہے ۔ تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لو ۔ فی الحقیقت تم میں سے زیادہ باعزت وہی شخص ہے جو (اللہ تعالیٰ) کا زیادہ تقویٰ رکھتا ہو۔

☆ نزول مدینہ اور حکم مکی کی مثال ۔ سورۃ براءۃ کا پہلا حصہ ہے یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی مگر خطاب مشرکین مکہ سے ہے۔

مدنی آیات جن کا انداز خطاب مکی آیات کے مشابہ ہے ۔ ان کی ایک مثال : سورۃ الانفال مدنی ہے مگر اس

کی آیت نمبر 32 کا انداز بیان مکی آیات کے مشابہ ہے﴿واذ قالوا اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السمآء او ائتنا بعذاب الیم﴾ اور جب انہوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ قرآن حق ہے۔ تیری طرف سے نازل کیا گیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کردے یا ہم پر دردناک عذاب نازل کر۔ یہ کلمات ابوجہل نے زنجیر تھام کر کہے تھے۔ اسکی دعا کے دو حصے تھے۔ ایک آسمان سے پتھروں کی بارش دوسرا یا کوئی اور دردناک عذاب کی طلب۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ پر پتھروں کی بارش تو نہ کی اس لئے اس میں نبیؐ اور اصحاب نبیؐ موجود تھے۔ مگر دوسری طلب غزوۂ میں میں پوری ہوگئی کہ ابوجہل سمیت 70 خبیثان ازل جہنم رسید ہوئے۔ اور ستر قیدی ہوئے۔

☆ نزول مدنی انداز مکی۔ مثال۔ سورۃ النجم کی آیت نمبر 32 ﴿الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم ﴾ وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں البتہ چھوٹے گناہ ان سے سرزد ہوجاتے ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں: فواحش کے زمرے میں ہر وہ گناہ داخل ہے جس کی کوئی حد مقرر ہو۔ اور کبائر میں وہ گناہ داخل ہیں جن کا انجام جہنم ہو۔ اور لمم ان دونوں حدوں کے درمیان صغیرہ گناہ ہیں۔ نیکیوں اور نمازوں سے جن کی معافی ہوجاتی ہے۔

☆ وہ قرآن جو مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم نے مکہ سے مدینہ میں آکر انصار کو سکھایا پھر انکے بعد اتنے خوش ہوئے جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آپؐ کے آنے پر سورۃ الاعلیٰ پڑھی گئی۔ یہ صورت ان تمام سورتوں پر صادق آتی ہے۔ جنہیں مکہ سے لاکر انصار مدینہ کو پڑھایا جاتا تھا۔

اخر ما نزل:۔

اس بات میں بھی علماء کے اقوال مختلف ہیں۔

(1) آخر میں آیۃ الربا (سود کے بارے میں) نازل ہوئی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیۃ نمبر 278۔﴿ یآیھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا ﴾ اے ایماندارو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سودی رقم) کو چھوڑ دو۔

(2) دوسرا قول ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ کی نسائی وغیرہ کی روایت سے یہ ہے کہ آخر میں نازل ہونے والی آیت سورۃ البقرہ کی آیۃ نمبر 281 ﴿واتقوا یوماً ترجعون فیہ الی اللہ ﴾ ہے۔

(3) تیسرا قول یہ ہے کہ آخر میں نازل ہونے والی آیت سورۃ البقرہ کی آیۃ نمبر 282 ہے۔ جس میں قرض لینے دینے کے بارے میں ہدایت ہے ﴿یآیها الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمیً فاکتبوه﴾ اے ایماندارو! جب تم آپس میں ایک مقررہ مدت تک قرض لینے دینے کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ مذکورہ بالا تینوں روایات قرآن کریم میں ایک ترتیب کے ساتھ نازل ہوئی ہیں اور ان میں ایک دوسرے کی نفی اور اختلاف نہیں ہے۔

(4) چوتھا قول یہ ہے کہ آخر میں نازل ہونے والی آیۃ الکلالۃ ہے۔ بخاری و مسلم نے براء بن عازب کی روایت وارد کی ہے۔ کہ آخر میں نازل ہونے والی آیت سورۃ النساء کی آیت نمبر 176 ہے۔ ﴿ویستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالة﴾ وہ (صحابہؓ) آپؐ سے فتوی طلب کرتے ہیں۔ (سوائے نبیؐ) کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ (کلالہ اُس مرنے والے شخص کو کہا جاتا ہے۔ جس کی نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ زندہ ہوں)

(5) پانچواں قول یہ ہے کہ آخر میں یہ آیت نازل ہوئی سورۃ التوبۃ کی آیۃ نمبر (129،128) المستدرک میں ابی بن کعب روایت کرتے ہیں کہ آخری آیت یہ نازل ہوئی ہے۔ ﴿لقد جآء کم رسول من انفسکم الی آخر السورة﴾ تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا ہے۔ جس پر تمہاری تکلیف گراں گزرتی ہے۔ وہ تمہاری (خیر خواہی) میں حریص ہے۔ اور ایمانداروں پر شفقت کرنے والا بہت مہربان ہے۔ یہ آیت سورۃ البراءۃ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

(6) چھٹا قول یہ ہے کہ آخر میں سورۃ المآئدۃ نازل ہوئی ہے۔ ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہؓ کی روایت وارد کی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حلال وحرام کے بارے میں نازل ہونے والی یہ آخری سورت ہے۔ اور اس کے احکام منسوخ نہیں ہوئے۔

(7) ساتواں قول یہ ہے کہ آخر سورۃ آل عمران کی آیۃ نمبر 195 نازل ہوئی ہے۔ ﴿فاستجاب لھم ربھم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ بعضکم من بعض﴾ اسے ام سلمہؓ سے ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔

(8) آٹھواں قول یہ ہے کہ آخر میں نازل ہونے والی سورۃ النساء کی آیۃ نمبر 93 ہے: ﴿ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزآئہ جھنم خالدا فیھا وغضب علیہ ولعنہ واعدّ لہ

عذابا عظیما ﴾ اسے منسوخ نہیں کیا گیا۔ اسے مؤمن کے قتل عمد کے بارے میں آخری حکم کے طور پر نازل کیا گیا ہے۔

(9) نواں قول یہ ہے جسے مسلم نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ کہ آخر میں سورۃ النصر نازل ہوئی ہے۔ یہ آخری نازل ہونے والی سورت ہے۔ ان سب اقوال میں سے کوئی قول نبی تک مرفوع نہیں ہے۔ ہر عالم نے اپنے اجتہاد سے مختلف عنوانات کے تحت قرآن کے اول و آخر نازل ہونے کے بارے میں اظہار کیا ہے۔ اکمال دین سے متعلق سورۃ المآئدۃ کی آیۃ نمبر 3 نازل ہوئی ہے۔ وہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدان عرفات میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا ظاہر یہ دلالت کرتا ہے۔ کہ آج فرائض و احکام شریعت اور انعام الٰہی کا اتمام کر دیا گیا ہے۔ کہ ایمانداروں کو البلد الحرام پر قبضہ دے دیا گیا ہے۔ اور مشرکین کو اس سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ ان مذکورہ اقوال میں جو اختلاف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی راوی نے کسی دوسرے وقت میں سنا۔ نیز عنوانات کے اختلاف سے بھی اس اختلاف کی نشاندہی ہوتی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے قرآن کریم کی اقسام:۔

(1) پہلے قرآن کریم کھانوں کے عنوان کے تحت نازل ہوا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیۃ نمبر 145 ﴿قل لا اجد فی ما اوحی الیّ محرّما علی طاعم الا ان یکون میتۃ أو دماً مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس او فسقا اهل لغیر الله به فمن اضطرّ غیر باغ ولا عادٍ فان ربک غفور رحیم﴾ کہہ دیجئے میری طرف جو وحی کی گئی ہے اس میں کھانے والے پر مردار یا بہایا گیا خون یا سؤر کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔ بلا شبہ یہ سب چیزیں ناپاک ہیں یا وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔ وہ بھی نافرمانی کا حال ہے۔ سو جو شخص (شدت فاقہ کی وجہ سے) مجبور ہو۔ (وہ ان میں سے) کچھ کھا سکتا ہے۔ مگر اُسے بھی چاہت نہ ہو اور نہ وہ اس کا عادی ہو جائے (کہ پیٹ بھر شوق سے کھائے یا اس کا عادی ہو جائے)

سورۃ البقرہ کی آیۃ نمبر 114 اور نمبر 115 بھی ایسے مضمون پر مشتمل ہیں۔ سورۃ المآئدۃ کی آیۃ نمبر 3 بھی حرام کھانوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ البتہ اس میں چند مزید حرام چیزوں کا بھی ذکر ہے۔ اور وہ ہیں گلا گھٹ کر مرا ہوا۔ چوٹ سے مرا ہوا، گر کر مرا ہوا اور سینگوں کی ٹکر سے

مرا ہوا جانور بھی حرام ہے۔ اسی طرح قسمت کے تیروں سے تقسیم کیا ہوا گوشت اور جسے درندوں نے چیر پھاڑ دیا ہو وہ بھی حرام ہے۔ البتہ اگر وہ جانور زندہ ہو اور تم نے اُسے ذبح کر لیا ہو۔ اور جو غیر اللہ کے نام پر کسی استھان پر یا بت کے نام پر ذبح کیا گیا ہو وہ بھی حرام ہے۔ (البتہ اگر سدھائے ہوئے شکاری کتوں پر تم نے اللہ کا نام لے کر چھوڑا ہو وہ شکار کو پکڑ کر تمہارے لئے محفوظ رکھیں خود نہ کھائیں تو وہ تمہارے لئے حلال ہے)

(2) پینے کی چیزوں میں پہلے جو قرآن نازل ہوا اس میں سورۃ البقرہ کی آیۃ نمبر 219 میں پہلی آیت شراب کی حرمت پر نازل ہوئی ہے۔ کہ شراب تین مراحل میں حرام کی گئی ہے۔ پہلی دفعہ صرف یہ کہا گیا کہ شراب حرام ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانے دیں۔

آپ ﷺ خاموش رہے۔ پھر دوسرے مرحلہ میں یہ حکم نازل ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ صحابہؓ نے کہا: کہ ہم نماز سے قریبی وقت میں شراب نہ پئیں؟ آپ ﷺ خاموش رہے۔ تیسرے مرحلہ میں یہ آیۃ نازل ہوئی ﴿ یا ایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر الخ ﴾ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب شراب قطعاً حرام کر دی گئی ہے (رواہ الطیالسی فی مسندہ)

(3) قتال کے بارے میں جو پہلی آیت نازل ہوئی وہ سورۃ الحج کی آیت نمبر 39 ہے ﴿ أذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا وان الله علیٰ نصرهم لقدیر ﴾ اول و آخر نازل ہونے والے قرآن کی بحث کے کئی فائدے ہیں۔

(الف) اس سے قرآن کریم کی آیات کی حفاظت اور ضبط و تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

(ب) اسلامی شریعت کے تاریخی اسرار کا علم حاصل ہوتا ہے۔

(ج) اس بحث کے ذریعے ناسخ و منسوخ کا علم حاصل ہوتا ہے۔

xxxxxxxxx

(اسباب نزول)

السوال:۔ اسباب نزول پر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔قرآنِ کریم کے نزول کا اصل سبب تو انسانیت کی فلاح و بہبود کی طرف رہنمائی تھا۔تاہم بعض واقعات وحوادث سے متعلق بعض آیات میں خاص اشارات پائے جاتے تھے۔صحابہؓ رسول اللہؐ سے ان کے بارے میں پوچھتے تھے۔تو رسول اللہؐ نے اس سلسلہ میں بہت توجہ کی ہے۔
بعض محقق علماء نے اس بارے میں کتابیں تالیف کی ہیں۔ان میں مشہور بخاری کے شیخ علی بن المدینی اور ابو الحسن علی بن احمد نحوی مفسر الواحدی ہیں۔جو سنہ 427 ھجری میں فوت ہوئے۔الواحدی نے 'اسباب النزول' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔پھر شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اسبابِ نزول پر ایسی کتاب تالیف کی ہے جس کی مثال کا ملنا محال ہے۔

(اسباب نزول کی معرفت میں کس امر پر اعتماد کیا جاتا ہے؟)

علماء اسباب نزول کے بارے میں صحیح مرفوع روایات پر یا صحابہؓ کی موقوف روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔الواحدی نے اپنے زمانہ کے علماء کے تساھل (بے خبری) پر سخت گرفت کی ہے۔اور کہا ہے:بغیر تحقیق دقیق کے تفسیرِ قرآن میں اپنی رائے کو دخل دینا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔البتہ جب کسی تابعی کی مرسل روایت کی کسی دوسری مرسل روایت سے تائید ہوتی ہو تو وہ قابلِ قبول ہے۔جس نے کسی صحابیؓ سے وہ تفسیر اخذ کی ہو۔جیسے مجاہد،عکرمہ اور سعید ابن جبیر ہیں۔محمد بن سیرین تابعی جو بصرہ کے جید عالم تھے۔
کہتے ہیں امیں نے عبیدہ سے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر پوچھی۔تو اس نے کہا:اللہ سے ڈر اور درست بات کر وہ لوگ یعنی صحابہؓ تو گذر گئے جو اسبابِ نزول کو جانتے تھے۔(اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحیح اور مرفوع روایات پر اعتماد کرنا ہی قابلِ ترجیح ہے)

(تعریف السبب)

سببِ نزول کی معرفت دو امور پر منحصر ہے۔

(1) کسی خاص واقعہ کا پیش آنا پھر اس کے بارے میں قرآنی آیات کا نازل ہونا۔جیسے ابن عباسؓ نے کہا ہے!جب سورۃ الشعراء کی آیت نمبر 214 ﴿وانذر عشیرتک الاقربین﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے صفا پہاڑ پر چڑھ کر آواز دی!یا صباحاہ (صبح کے وقت کوئی مصیبت آنے والی ہے) تو سب اہلِ خاندان آپؐ کی آواز پر جمع ہوگئے ان میں آپؐ نے فرمایا:اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کی چوٹی سے ایک گھڑ سوار لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔تو کیا تم مجھے سچا

سمجھو گے؟

سب نے کہا: ہم نے کبھی آپ کو جھوٹا نہیں پایا، آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہیں (اللہ کے) سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں یہ سن کر ابولہب نے کہا: آپ کی بربادی ہو۔ معاذ اللہ۔ کیا تو نے ہمیں اسی لئے یہاں جمع کیا ہے؟ پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس پر سورۃ، تبت یدا، نازل ہوئی۔

(2) کسی حکم شریعت کے بارے میں رسول اللہؐ سے پوچھا گیا تو اس کے جواب میں حکم شریعت نازل ہوا ہو۔ جیسے خولہ بنت ثعلبہؓ نے رسول اللہؐ سے ایک شرعی حکم پوچھا تھا۔ جب اس کے خاوند اوس بن صامتؓ نے اس سے ظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ تو میرے لئے اسی طرح ہے جیسے میری ماں کی پشت ہو۔ خولہ اپنی داستان غم بیان کرتی رہی۔ اسی دوران حکم شریعت پر مشتمل سورۃ المجادلۃ کی آیات نازل ہوئیں۔ (اس روایت کو ابن ماجہ، ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا تھا۔ ابن مردویہ اور امام بیہقی نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے) اس سے یہ مراد نہیں کہ انسان ہر آیت کا سبب تلاش کرے۔ قرآن کا نزول کا اصل سبب تو لوگوں کے باطل عقائد کی اصلاح، توحید و رسالت اور فلاح و بہبود اخروی کے صراط مستقیم پر چلانا ہے۔ تاکہ انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر شریعتِ الٰہیہ پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کر سکیں اور اس کے سخت عذاب سے بچ سکیں قرآن کا نزول اسباب و واقعات پر منحصر نہیں ہے۔ لہٰذا نزول قرآن دو قسموں پر ہے۔ کچھ حصہ تو کسی خاص واقعہ کے بعد نازل ہوا یا کسی سوال کے جواب میں نازل ہوا ہے۔

اس قرآن کی مثال جو کسی خاص واقعہ کے بارے میں نازل ہوا۔ اس حصے میں گذشتہ حالات کی خبریں ہیں۔ جیسے سورۃ الفیل ہے کہ اس میں حبشہ کی فوج کی خبر ہے۔ جسے یمن کا گورنر باذان کسریٰ و ایران کے حکم پر ابرھہ اصحمہ کی سرکردگی میں بیت اللہ کو گرانے کے لئے بھیج چکا تھا۔ اور وہ فوج ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ اور اس بد ارادے پر جوان کا حشر ہوا اس کی خبر ہے۔ اس طرح قوم نوح، عاد و ثمود اور تعمیر بیت اللہ کے قصے ہیں اسی طرح سورۃ النساء کی آیت نمبر 125 میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنانے کا ذکر کیا ہے۔ ﴿ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا ﴾ یہ سب خبریں اسباب نزول کے ضمن میں نہیں آتیں بلکہ گذشتہ احوال و واقعات کی خبریں ہیں۔

(اسبابِ نزول کی معرفت کے فائدے:)

(الف) کسی شرعی حکم کی حکمت واضح ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے حوادث میں ازالے کا صحیح طریق

اختیار کرنے کا علم حاصل ہوتا ہے۔

(ب) کسی عام حکم کی تخصیص کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال سورہ آل عمران کی آیت نمبر 188 ہے: ﴿ لا تحسبن الذین یفرحون بما اتوا ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنهم بمفازة من العذاب ولهم عذاب الیم ﴾ اس آیت میں حکم عام ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے مال ومتاع پر خوش ہوتے ہیں اور اپنے نا کردہ کاموں پر اپنی تعریف کے طالب ہیں تو (اے نبیؐ) ان سے متعلق یہ خیال نہ کریں کہ وہ دردناک عذاب سے چھوٹ جائینگے۔ اس آیت سے مردوں نے سمجھا کہ ہر انسان اپنے مالومتاع پر خوش ہوتا ہے۔ تو کیا ہر انسان کو دردناک عذاب لاحق ہوگا؟ اس نے اس آیت کی تفسیر پوچھنے کے لئے اپنے غلام رافع کو حضرت ابن عباسؓ کے پاس بھیجا تو آپ نے فرمایا: یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں خاص ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کوئی سوال پوچھا تو انہوں نے حق بات کو چھپانے پر خوش ہوتے ہوئے نکل گئے۔ (الاتقان ج 1 ص 21)

(ج)......جب لفظ نزول عام ہو۔ اور کوئی ایسی دلیل بھی وارد ہو جو اس عام کی تخصیص کرتی ہو۔ تو سبب کی معرفت اس عام صورت کے علاوہ دوسری صورت کی تخصیص کرتی ہے۔ اس لئے کہ لفظ عام میں حتمی طور پر سبب کی صورت داخل ہوتی ہے۔ اس کی مثال۔ سورۃ النور کی آیات 23، 24 اور 25 ہیں۔ جن میں حکم کے الفاظ عام ہیں۔ کہ جو لوگ مومنہ، محصنہ کو الزاماتِ تہمت سے بے خبر عورتوں کو برائی کا الزام دیتے ہیں۔ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے۔ اور ان کیلئے بہت بڑا عذاب ہے جس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دینگے۔ اس دن اللہ تعالیٰ انہیں ٹھیک ٹھیک بدلہ دے گا۔ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ بالکل حق اور سچا ہے۔ آیت کے الفاظ تو عام ہیں مگر یہ آیت خاص طور پر حضرت عائشہؓ یا سب ازواج نبیؐ کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں اور ان پر الزام لگانے والوں کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ (ابن عباسؓ) ازواج النبیؐ کے علاوہ دوسری عورتوں پر الزام لگانے والوں کی توبہ قبول کر لی جائے گی۔ اس کا اظہار سورۃ النور کی آیات نمبر 4، 5 میں واضح ہے۔ ﴿ والذین یرمون المحصنت الی قوله: الا الذین تابوا ﴾ اگرچہ ایسے لوگ بھی آیت کے عموم میں داخل ہیں۔ مگر سورۃ النور کی آیات نے انہیں مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اور عموم سے نکال کر ان کی تخصیص کر دی ہے۔

سببِ نزول کی معرفت قرآن کے معانی سمجھنے کے لئے بہترین طریقہ ہے۔ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 188 کے فہم میں مروان ابن الحکم کو مشکل اسی لئے پیش آئی تھی۔ کہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ جانتا تھا۔ ابن عباسؓ نے اس کی وضاحت کی۔ تو اس کی مشکل حل ہوئی۔

دوسری مثال یہ آیت ہے ﴿ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت اواعتمر فلا جناح علیہ ان یطوّف بھما ومن تطوع خیرا فان اللہ شاکر علیم﴾ سورۃ البقرۃ آیہ نمبر (158) بیشک صفا، درمروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ سو جو شخص خوشی سے کوئی عمل کرے تو اللہ تعالیٰ (اس کا) قدردان خوب جاننے والا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے عروہ نے کہا: اس آیت کے ظاہر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حج یا عمرہ کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر وہ ان کا طواف نہ کرے۔ اوران کا طواف واجب معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: بھانجے تو نے بہت غلط سمجھا ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے: فلا جناح علیہ ان لا یطوف بھما۔ اگر وہ ان کا طواف نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس آیۃ کا سببِ نزول یہ ہے کہ انصار زمانۂ جاہلیت میں ان دونوں کا طواف کیا کرتے تھے۔ ان بتوں پر دو، بدمعاشوں کے بت، رکھے ہوئے تھے۔ صفا پر اساف اور مروہ پہ نائلہ کا بت رکھا ہوا تھا۔ (ان دونوں نے بیت اللہ کے طواف کے دوران زنا کیا تھا۔ وہ دورِ جاہلیت میں مادرزاد ننگے بدن کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ان دونوں خبیثوں کو پتھر بنا دیا تھا۔ بالآخر مشرکین نے پرستش کے لئے ان دونوں کے بت، اٹھا کر صفا اور مروہ پر رکھ دیئے تھے۔ حالانکہ ان خبیث بتوں کو گہرے گڑھے میں دفن کر دینا چاہیے تھا۔ مگر مشرک کی عقل میں فتور اور خلل ہوتا ہے۔ انصار زمانۂ جاہلیت میں ان کو متبرک سمجھتے تھے۔ اور طواف کے دوران ان کو چھوتے تھے۔ جب وہ اسلام سے مشرف ہوئے تو حج و عمرہ کے دوران انہوں نے صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے کو گناہ سمجھا تھا جس پر سورۃ البقرۃ کی آیۃ نمبر 158 نازل ہوئی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے اس آیت کا سببِ نزول عروہ کو اس طرح بتایا تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی کو اختیار نہیں کہ *ان دونوں کے طواف کو چھوڑ دے۔ اس فرمان سے طواف کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا تھا۔ کہ (صفا و مروہ کے درمیان) سعی واجب ہے مگر وہ حج و عمرہ کا رکن نہیں ہے۔ اور اس کے تارک پر دم لازم ہے۔*

(ھ) سورۃ الاحقاف آیۃ نمبر 17 ﴿والذی قال لوالدیہ اف لکما اتعداننی ان اُخرج وقد خلت القرون من قبل وھما یستغیثان اللہ ویلک آمن ان وعد اللہ حق فیقول ما ھذا الا اساطیر الاولین﴾ اس آیت کے ظاہر سے اشارہ ملتا ہے۔ کہ اس میں کسی خاص فرد کا قصہ ہے۔ جب حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا تو مدینہ کے گورنر مروان کو حکم دیا کہ اہل مدینہ کو جمع کر کے ان سے یزید کی بیعت لینے کا اہتمام کر۔ اس نے اہل مدینہ کو جمع کر کے یزید کی بیعت کا مطالبہ: کیا تو عبدالرحمان بن ابی بکر نے انکار کیا۔ مروان نے انہیں سزا دینے کا ارادہ کیا۔ عبدالرحمان کو پکڑنے کا مروان نے حکم دیا۔ مگر وہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ مروان کے کارندے اسے پکڑ نہ سکے۔ مروان نے جہالت سے سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 158 کو اس پر چسپاں کر دیا۔ کہ یہ آیت عبدالرحمان بن ابی بکر ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابوبکرؓ نے حضرت عمر کو نامزد کیا تھا۔ لہذا عبد الرحمان اپنے باپ کا نافرمان ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کہ قرآنی آیات میری بریت ہی کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ اور مذکورہ آیت ہمارے خاندان کے بارے میں نازل نہیں ہوئی (اخرجہ البخاری) حضرت عائشہؓ نے مروان کی اس تعبیر پر فرمایا: کہ مروان نے جھوٹ کہا ہے۔ اگر میں چاہوں تو اس شخص کا نام لے سکتی ہوں جس کے بارے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی ہے (معلوم ہوا کہ اموی حکمران اختلاف کرنے والے پر وحشی درندوں کیطرح جھپٹتے تھے۔ مروان نے عبدالرحمان سے کہا: خلیفہ نامزد کرنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنھما کی سنت ہے۔ عبدالرحمان نے کہا: یہ قیصر روم کی سنت ہے۔ جاہل مروان کو علم نہ ہوا کہ ابوبکر و عمرؓ نے اپنے مرنے کے بعد نام تجویز کیے تھے۔ اور معاویہؓ اپنی زندگی میں یزید کی بیعت لے رہے ہیں۔ جب اقتدار کی ہوس غالب ہو تو ایسی ہی غیر معقول حرکات ہوتی ہیں۔

xxxxxxxxxx

سوال:۔ خاص سبب کی بجائے لفظی عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس پر مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔ جب نازل ہونے والا قرآن عام سبب کی وضاحت کرے۔ یا خاص سبب سے اتفاق کرے یعنی مناسبت رکھتا ہو۔ تو عام سبب کو عموم پر اور خاص سبب کو خصوص پر خیال کیا جاتا ہے۔ عموم کی مثال سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 222 ہے: ﴿یسئلونک عن المحیض قل ھو اذیً فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوھن حتی یطھرن فاذا تطھرن

فأتوهن من حيث امركم الله ان الله يحب التوابين ويحب المتطهرين ﴾
لوگ آپؐ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے۔ وہ (عورتوں کی) ایک تکلیف ہے۔سو حیض کے دوران عورتوں سے الگ رہو۔(یعنی جماع نہ کرو) یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔پھر جب وہ پاک ہو جائیں۔تو ان کے پاس آؤ (یعنی ان سے مجامعت کرو) (جس مقام میں جماع کرنے کا) اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک ہونے والوں سے محبت کرتا ہے۔حضرت انسؓ نے کہا ہے: جب کوئی عورت حائض ہوتی تھی تو یہود اُسے گھر سے نکال دیتے تھے۔اس بارے میں رسول اللہؐ سے پوچھا گیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی۔پھر رسول اللہؐ نے فرمایا: ان (عورتوں) کے ساتھ گھر میں اکٹھے رہو۔ جماع کے علاوہ

باقی ہر طرح کی مباشرت سے فائدہ اٹھاؤ۔ دوسری مثالیں یعنی الفاظ عمومی اور مراد مخصوص۔ سورۃ اللیل کی آیات 17، 18، 19، 20، 21 ﴿وسيجنبها الاتقى الذى يؤتى ماله يتزكىٰ . وما لاحد عنده من نعمة تجزى . الا ابتغاء وجه ربه الاعلىٰ ولسوف يرضىٰ ﴾ یہ آیات عام الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی ہیں۔مگر ان سے مراد مخصوص ہے۔یعنی ابوبکر صدیقؓ مراد ہیں۔الاتقی میں الف لام عہد کے لئے ہے۔جس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ مراد ہیں۔الف لام عموم کا اس وقت فائدہ دیتا ہے۔جب یہ موصولہ یا معرفہ ہو۔اور الاتقی میں الف لام موصولہ نہیں اس لئے افضل التفضیل کا صیغہ کسی دوسری چیز کے مقابلے میں تمیز کے لئے آتا ہے۔الواحدی کہتے ہیں کہ تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیات حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔حضرت عروہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مال سے درج ذیل سات غلام خرید کر آزاد کئے تھے: جنہیں ایمان لانے پر بہت عذاب دیا جاتا تھا۔وہ حضرت بلالؓ، عامر بن فہیرۃ، لونڈی نہدیہ اور اس کی بیٹی، ام عیسیٰ اور بنی مؤمل کی ایک لونڈی (اخرجہ ابن ابی حاتم) جب نزول آیت کا سبب خاص ہو۔مگر آیت عام الفاظ کے ساتھ نازل ہوا تو اصولیوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔کہ عموم لفظ کا اعتبار کیا جائے گا یا مخصوص سبب کا؟

(1) جمہور کا مذہب ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار کیا جائے گا۔یعنی اس کا حکم عام ہوگا۔سب مسلمانوں کو شامل ہوگا۔جیسے لعان کی آیت ہے کہ وہ ھلال بن امیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

مگر اس کے حکم میں تمام مسلمان شامل ہیں۔ یعنی سبب خاص ہے۔ مگر اس کا حکم عام ہے۔ یعنی جو مسلم بھی اپنی بیوی پر کوئی تہمت لگائے گا تو اس پر یہی حکم لاگو ہوگا۔ جب وہ کوئی چار گواہ نہ پیش کر سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہلال بن امیہ سے فرمایا: گواہ پیش کرو ورنہ تیری کمر پر حد قذف اسی کوڑے لگیں گے۔ اسی دوران سورۃ النور کی آیات 6، 7، 8 اور 9 نازل ہوئیں۔ ﴿والذین یرمون ازواجهم ﴾ الی قوله: ان کان من الصادقین (البخاری، الترمذی، وابن ماجه) اگرچہ ان آیات کے نزول کا سبب خاص ہے مگر الفاظ عموم کے صیغہ کے ساتھ ہیں اس لئے اس عموم میں سب اہلِ اسلام شامل ہیں۔ یہی رائے قابلِ ترجیح اور زیادہ صحیح ہے۔ جس امر پر صحابہؓ مجتہدین متفق ہیں وہ یہ ہے۔ کہ جو آیت عام احکام شریعت سے مناسبت رکھتی ہو۔ اس کے نزول کا سبب خواہ خاص ہو۔ مگر اس کے عموم میں سب مسلم شامل ہیں۔ جیسے اوس بن صامت نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ سے ظہار کر دیا تھا۔ تو اس پر آیات نازل ہوئیں۔ جن میں ظہار کے بارے میں مفصل حکم تھا مگر اس کے حکم میں تمام مسلمین شامل ہیں۔ اسی طرح آیۃ الکلالۃ حضرت جابر بن عبداللہؓ کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی مگر اس کا حکم عام ہے۔ جو کسی خاص سبب کی بناء پر نازل ہوا ہے۔ اس حکم کے نفاذ میں کوئی مخصوص آدمی متعین نہیں ہوتا۔

(2) کچھ لوگوں کا مذہب ہے۔ کہ عموم الفاظ کی بجائے خاص سبب کا اعتبار کیا جائے گا۔ مگر یہ رائے راجح نہیں ہے۔ پہلا مسلک صحیح ہے جس کی تفصیل نمبر 1 میں دی گئی ہے۔

السوال:۔ سبب نزول کے صیغہ پر مختصر نوٹ لکھئے۔

الجواب:۔ سبب نزول کا صیغہ (الفاظ) یا تو صریح نص پر مشتمل ہوگا۔ یا اس میں احتمال ہوگا۔ یعنی صریح نص کی بجائے اس میں تردد ہوگا۔ اس میں کوئی یقینی فیصلہ نہیں کیا جا سکے گا۔ جب راوی یہ کہے کہ اس آیت کا سبب صریح ہوگا۔ اس آیۃ کا سبب نزول اس طرح ہے۔ یا جب واقعہ کے ذکر کے بعد مادۂ نزول پر فاء تعقیبیہ داخل کر دے۔ یا کسی سوال کے جواب میں آیت نازل ہوئی ہو۔ جیسے راوی کہے: اس طرح واقعہ ہوا یا رسول اللہؐ سے کوئی شرعی حکم پوچھا گیا تو آیت نازل ہوئی۔ یہ دونوں طرح کے الفاظ کسی آیت کے سبب نزول پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ جب راوی اس طرح کہے کہ یہ آیت کسی حکم شرعی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس میں حتمی علم نہ ہو۔ تو ایسے صیغے میں احتمال ہوگا۔ کبھی اس سے مراد سبب نزول ہوگا۔ اور کبھی

مراد نہ ہوگا۔ کہ یہ حکم آیۃ کے معنیٰ میں داخل ہے۔ اسی طرح جب راوی کہے: میرا خیال ہے کہ یہ آیت اس حکم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لفظ کے ساتھ راوی کہے: میرا خیال ہے کہ یہ آیت اس حکم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لفظ کے ساتھ راوی کوئی حتمی حکم نہیں لگاتا بلکہ اس میں احتمال اور شک پایا جاتا ہے۔ صریح صیغہ کی مثال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے۔ ﴿نساء کم حرث لکم فاتوا حرثکم انّٰی شئتم﴾ ابن عمرؓ نے حتمی صیغہ کے ساتھ کہا ہے۔ کہ یہ آیت عورتوں کی دُبر میں وطی کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جس آیت کے سبب نزول میں تعین نہ ہو بلکہ احتمال ہو اس کی مثال عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت ہے۔ جو سورۃ النسآء کی آیت نمبر 65 کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ ﴿فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم الخ﴾ عبداللہ بن زبیرؓ نے کہا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ آیت زُبیر اور ایک انصاری کے درمیان جھگڑنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ جھگڑا یہ تھا۔ میدانِ حرہ میں ایک برساتی نالہ تھا۔ انصاری نے (زبیر سے) کہا: پانی کو گزرنے دو۔ نہ روکو زبیرؓ کی کھجوریں انصاری کی کھجوروں سے پہلے تھیں وہ اپنی کھجوروں کو انصاری کی کھجوروں سے پہلے سیراب کرتے تھے۔ حق بھی یہی تھا مگر انصاری نے کہا کہ پانی کو نہ روکئے۔ زُبیرؓ نے انکار کیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: اے زبیر! اپنی کھجوروں کو سیراب کر کے پھر انصاری کی طرف پانی کو چھوڑ دے۔ انصاری نے ناراض ہو کر کہا: زبیرؓ آپ کا پھوپھی زاد ہے۔ (اس لئے آپؐ نے اس سے رعایت کی ہے) رسول اللہؐ کا چہرہ مبارک (غصے سے) سرخ ہو گیا۔ پھر فرمایا، اے زبیرؓ! اپنی کھجوروں کو اتنا پانی پلا جو منڈیروں (وٹوں) کے سرے تک پہنچ جائے۔ صریح حق بھی یہی تھا (کہ نالے پر جس کی کھجوریں پہلے ہوں وہ اپنی کھجوروں کو بھرپور پانی دے کر ہمسائے کی طرف چھوڑ دے)۔ رسول اللہؐ نے زبیرؓ کو حکم خدا کے مطابق پورا حق دلا دیا۔ پہلے رسول اللہؐ نے زبیرؓ کو وسعت اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ کہ مناسب سیرابی کے بعد پانی کو انصاری کی طرف چھوڑ دے مگر جب انصاری نے رسول اللہؐ پر اعتراض کر دیا تھا تو آپؐ نے زبیرؓ کو پورا حق دلا دیا۔ زبیرؓ نے کہا: میں خیال کرتا ہوں کہ سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت فی کذا، کے قول صحابی کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ کیا یہ قول صحابیؓ مرفوع حدیث کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر وہ سبب نزول بھی بیان کر دے یا صحابی کی اجتہادی تفسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ قول

صحابی کو مرفوع حدیث کا درجہ دیتے ہیں۔ دوسرے محدثین اسے مسند مرفوع کا درج نہیں دیتے۔ البتہ جب کوئی صحابی سبب کا ذکر کر کے اس کے بعد یہ کہے: کہ یہ آیت اس سبب کی بناء پر نازل ہوئی ہے۔ تو سب محدثین مفسرین اسے مسند مرفوع کا درجہ دیتے ہیں۔ زرکشی نے البرھان، میں کہا ہے: صحابہؓ اور تابعین کی عادت تھی۔ جب وہ کہتے تھے۔ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ تو ان کی مراد یہ ہوتی تھی۔ کہ اس آیت میں یہ حکم شرعی شامل ہے۔ اس کا سبب ان کے پیش نظر نہیں ہوتا تھا۔

السوال:۔ سبب نزول کے بارے میں متعدد روایات پر نوٹ لکھیے۔

الجواب: ایک ہی آیت کے بارے میں کبھی کئی روایات وارد ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں مفسر درج ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

(ا) جب سبب کا صیغہ صریح نہ ہو۔ جیسے، نزلت ھذہ الآیۃ فی کذا، یہ آیت اس طرح کے مسائل میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے مراد مفسر کی اجتہادی تفسیر ہوتی ہے۔ یعنی اس آیت سے یہ فائدہ حاصل ہوا ہے یا، احسبھا نزلت فی کذا، میرا خیال ہے کہ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے مراد مفسر کی اجتہادی تفسیر ہوتی ہے۔ یعنی اس آیت سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ سبب نزول کا ذکر مراد نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کسی ایک سبب پر کوئی قرینہ موجود ہو۔ تو سبب واضح ہوتا ہے۔

(ب) جب ایک صیغہ غیر صریح ہو۔ جیسے، نزلت فی کذا، اور کوئی دوسرا صریح صیغہ اسی آیت کے بارے میں وارد ہو۔ تو وہ صیغہ سبب کے بارے میں صریح نص شمار ہوگا۔ اور غیر صریح صیغہ آیت سے احکام مستفاد ہوں گے۔ اس کی مثال وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا قول ﴿نساء کم حرث لکم فاتوا حرثکم انیٰ شئتم﴾ کے بارے میں وارد ہے۔ حضرت نافع نے کہا ہے۔ میں نے ایک دن ﴿نساء کم حرث لکم﴾ پڑھا تو ابن عمرؓ نے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ یہ آیت کس بارے میں نازل ہوئی ہے؟ میں نے کہا: نہیں ابن عمرؓ نے فرمایا: یہ آیت عورتوں کی دبر میں وطی کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اخرجہ البخاری وغیرہ) سو ابن عمرؓ کے یہ الفاظ غیر صریح ہیں۔ اس کے خلاف عبداللہ بن جابرؓ کی تفصیلی صریح روایت وارد ہے جو اس آیت کے سبب نزول کی پوری وضاحت کرتی ہے۔ (یہود کا یہ خیال تھا) کہ جب آدمی اپنی بیوی کے پیچھے سے (یعنی الٹا کر کے) شرمگاہ میں دخول کرے تو اس صورت میں پیدا ہونے

والا بچہ بھینگا ہوتا ہے (وہ ترچھی آنکھیں کر کے دیکھتا ہے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی (جابرؓ انصاری تھے مدینہ کے یہود کی عادات کو جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس آیت کا سبب صراحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ یہ روایت بھی بخاری اور دوسرے اہل سنن نے روایت کی ہے۔ یہ اجتہادی تفسیر ہے۔ صریح نص نہیں ہے۔ اور یہ اجتہادی خطا تھی۔

(ج) جب کسی سبب کے بارے میں کئی روایات ہوں۔ اور سب میں الفاظ صریح ہوں۔ ان میں ایک روایت صحیح ہو۔ تو صحیح روایت پر اعتماد کیا جائے گا۔ اس کی مثال جندب البجلی کی روایت ہے جسے بخاری مسلم نے روایت کیا ہے۔ جندبؓ کہتے ہیں۔ نبیؐ بیمار ہوئے تو دو یا راتیں قیام اللیل کے لئے اٹھ نہ سکے۔ ایک عورت نے آکر کہا: اے محمدؐ میرا خیال ہے کہ آپؐ کے شیطان نے آپ کو چھوڑ دیا ہے۔ (اس خبیث عورت نے معاذ اللہ جبریل امین کو شیطان کہا۔ وہ دو یا تین راتیں آپؐ کے پاس نہیں آئے تھے۔ اس پر سورۃ والضحیٰ نازل ہوئی۔ طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے حفص بن میسرہ سے اس نے اپنی ماں سے اس نے اپنی لونڈی سے (جو رسول اللہؐ کی خادمہ تھی) روایت کیا ہے۔ کہ کتے کا ایک بچہ نبیؐ کے گھر میں داخل ہوا۔ نبی کی چارپائی کے نیچے مر گیا۔ اس بناء پر نبیؐ کے پاس چار دن تک جبریل امین نہ آئے۔ آپؐ نے خادمہ خولہ سے فرمایا: رسول اللہؐ کے گھر میں جھاڑو دے لوں۔ میں جھاڑو لے کر چارپائی کے نیچے جھکی۔ پھر میں نے وہ مرا بچہ نکال دیا۔ نبی کانپتے ہوئے تشریف لائے۔ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ والضحیٰ الی قولہ فترضیٰ تک نازل کی۔ حافظ ابن حجر بخاری کی شرح میں کہتے ہیں۔ جبریل امین کے تاخیر سے آنے کا قصہ مشہور ہے۔ کہ یہ تاخیر کتے کے بچے کے گھر میں داخل ہونے کی وجہ سے تھی۔ مگر پلے کا گھر میں ہونا والضحیٰ کے نزول کا سبب نہیں ہے۔ بخاری مسلم کی مذکورہ روایت ہی صحیح ہے۔ جس عورت نے آپؐ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا روای مجہول ہے۔ قابل اعتماد نہیں ہے۔

سورۃ النور کی آیات اللعان 7، 8، اور 9 ہلالؓ بن امیہ کے قصے میں نازل ہوئیں۔ ہلال نے اپنی بیوی پر بدکاری کا الزام لگایا تھا۔ کہ میں نے اسے شریک بن سحماء کے ساتھ بدکاری کی حالت میں دیکھا ہے۔ بخاری اور مسلم سھل بن سعد کی روایت بھی اس بارے میں بیان کی ہے۔ عویمر نے رسول اللہؐ سے پوچھا: اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر آدمی کو بری

حالت میں دیکھے۔ غیرت میں آکر اُسے (آدمی) کو قتل کردے تو کیا آپ اس عورت کے خاوند کو قتل کردینگے؟ یا اس کے ساتھ آپ کیا سلوک کریں گے۔ ان دونوں روایات میں جمع وتطبیق اس طرح ہوگی۔ کہ پہلے ھلال کا حادثہ ہوا۔ پھر اسی طرح عویمر کا قصہ بھی ھلال کے حادثہ کے قریبی زمانے ہی میں وقوع پذیر ہوگیا۔ اور دونوں کے بارے میں یکساں فیصلہ اور حکم نازل کیا گیا۔ ابن حجرؒ نے کہا ہے۔ کہ مختلف اسباب کسی ایک حکم کے نافذ ہونے سے مانع نہیں ہوسکتے۔

(د) اگر زمانے کی دوری کی وجہ سے جمع وتطبیق ممکن نہ ہو تو اُسے تعددِ نزول اور تکرار پر محمول کیا جائیگا۔ اس کی مثال وہ روایت ہے جسے بخاری اور مسلم نے مسبب کے بارے میں بیان کیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 113 ایک دفعہ ابوطالب کی موت کے وقت نازل ہوئی دوسری دفعہ جب آپؐ نے اپنی والدہ کی قبر پر ان کی بخشش کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اجازت چاہی۔ ابوطالب کی موت کے وقت نبیؐ اُن سے کلمہ طیبہ ادا کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ مسلسل انہیں کفر پر قائم رہنے کی تلقین کر رہے تھے بالآخر ابو طالب نے یہ کہا کہ میں نے عار پر آگ کو ترجیح دی۔ یعنی میں عبدالمطلب ہی کے مذہب (شرک) پر مرنا چاہتا ہوں۔ تب نبیؐ نے فرمایا: جب تک مجھے روکا نہ گیا میں آپ کے لئے بخشش مانگتا رہوں گا۔ اس پر سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 113 نازل ہوئی۔ ﴿ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین الخ ﴾ نبی اور ایمان داروں کو لائق نہیں کہ وہ مشرکین کے لئے بخشش کی دعا کریں۔

☆ اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک آدمی کو اپنے ماں باپ کے لئے بخشش مانگتے ہوئے سنا۔ (اور وہ شرک پر مرے تھے) تو حضرت علیؓ نے فرمایا: تو اپنے مشرک ماں باپ کے لئے بخشش مانگتا ہے۔ اس نے کہا ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس پر بھی وہ آیت نازل ہوئی (اخرج الترمذی)

☆ حاکم وغیرہ نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ ابن مسعودؓ نے کہا ہے۔ دو نبیؐ ایک دن قبرستان کیطرف نکلے۔ اور ایک قبر کے پر بیٹھ کر کافی دیر تک سرگوشی کی۔ پھر رونے لگے جس قبر پر آپ بیٹھے تھے وہ آپ کی والدہ کی قبر تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے ان کے لئے دُعاءِ بخشش کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ تب مجھ پر آیت مذکورہ

نازل ہوئی۔اس کے اسباب نزول تین ہیں ۔اسی طرح ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔غزوۂ احد میں نبی حمزہؓ کی میت کے پاس کھڑے ہوئے اور فرمایا: میں آپ کے بدلے ستر مشرکین کا مثلہ کروں گا۔تو جبریل امین سورۃ النحل کی آیات 126، 127، 128 لے کر نازل ہوئے۔ ﴿وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم الی آخر السورۃ﴾ اگر تم سزا دو تو اتنی ہی دو جتنی سزا تمہیں دی گئی ہے۔(زیادتی جائز نہیں ہے) ایک دوسری روایت میں ہے کہ مذکورہ آیت فتح مکہ کے دن نازل ہوئی ہے اور سورہ مکیہ ہے۔جمع و تطبیق اس طرح ہے کہ آیت سورۃ کے ساتھ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی۔ پھر غزوۂ اُحد کے دن پھر فتح مکہ کے دن۔اس میں آیت کی عظمتِ شان، اپنے بندوں پر اللہ کی نعمت کی یاددہانی اور اور حکم شریعت کا اظہار مراد تھا۔ زرکشی نے البرھان میں کہا ہے۔کبھی کوئی آیت عظیم الشان ہونے کی وجہ سے دو مرتبہ نازل ہوئی۔تاکہ نئے سبب پر اس کی یاددہانی کرادی جائے۔تاکہ اُسے بھلایا نہ جاسکے۔علماء فن نے تعدد نزول اور تکرار کے بارے میں مذکورہ بالا آراء پیش کی ہیں۔میری رائے یہ ہے کہ متعدد روایات میں ترجیح کو اختیار کیا جائے۔تکرار نزول سے کوئی حکمت واضح نہیں ہوتی۔

لہذا متعدد روایات جو آیت نمبر 113 کے سبب نزول کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ان میں پہلی روایت ہی دوسری روایت پر قابلِ ترجیح ہے۔اس لئے کہ وہ صحیحین میں وارد ہوئی ہے۔لہذا وہ روایت ابوطالب ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔دوسری دو روایات مرجوح ہیں۔ صحیحین کی روایت کے مقابلے میں قاصر ہیں۔اسی طرح سورۃ النحل کی آخری آیات میں جو روایات ہیں وہ درجے میں برابر نہیں ہیں۔غزوۂ احد والی آیت ہی زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔یہ نہیں کہ وہ آیات کئی دفعہ تکرار کے ساتھ نازل ہوئی ہیں۔کبھی ایک ہی سبب کے بارے میں کئی روایات وارد ہوتی ہیں۔اس کی مثال حضرت ام سلمہؓ نے کہا: اللہ کے رسولؐ! میں ہجرت کی فضیلت کے بارے میں عورتوں کا کوئی ذکر نہیں سنتی تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 195 نازل فرمائی۔ ﴿فاستجاب لهم ربهم انی لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر او انثى بعضكم من بعض الخ﴾ اللہ تعالیٰ نے (ان کی خواہش کا)جواب دیا یعنی اسے قبول کرلیا۔میں یقیناً تم میں سے کسی مرد یا کسی عورت کا عمل ضائع نہیں کرتا۔تم سب ایک دوسرے سے منسلک ہو۔دوسری روایت بھی ام سلمہؓ ہی سے وارد ہے۔ وہ کہتی ہیں۔میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا۔قرآن میں ہمارا ذکر نہیں ہے مردوں ہی کا ذکر

ہوتا ہے؟ پھر ایک دن میں نے منبر پر رسول اللہ کی آواز سنی۔ آپ فرما رہے تھے ﴿ ان المسلمین و المسلمات ...... الیٰ آخر الآیۃ ﴾ سورۃ الاحزاب آیۃ 25۔

حاکم نے ام سلمہؓ سے تیسری روایت بھی کی ہے۔ ام سلمہؓ نے کہا: مرد غزوہ (جہاد) کرتے ہیں۔ عورتیں غزوہ نہیں کرتیں۔ ہمیں وراثت میں (مردوں سے) نصف حصہ ملتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت نمبر 22 نازل فرمائی: ﴿ ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنسآء نصیب مما اکتسبن الخ ﴾ جس چیز کے ذریعے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی آرزو نہ کیا کرو۔ مردوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے اور عورتوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے۔

السوال: حکم سے پہلے کسی آیت کے نازل ہونے پر مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب: ۔ زرکشی ایک اور قسم کا ذکر کرتے ہیں کہ کوئی آیت کسی خاص حکم شرعی کے سلسلہ میں نازل ہوتی ہے۔ مگر اس میں جو شرعی حکم شامل ہوتا ہے۔ اس پر عمل تاخیر سے کیا جاتا ہے۔ کبھی آیت مجمل الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی ہے۔ اس میں کئی ایک معانی شامل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر کسی ایک معنی کے مطابق کی جاتی ہے۔ اور اس کے حکمِ شرعی پر تاخیر سے عمل مطلوب ہوتا ہے۔ اس کی مثال سورۃ الاعلیٰ کی آیت نمبر 14 ہے: ﴿ قد افلح من تزکیٰ ﴾ وہ شخص کامیاب ہوا جس نے پاکیزگی حاصل کی۔ اس سے زکوۃ فطر کی دلیل لی جاتی ہے۔ بیہقی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت فطرانہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پھر اُسے ابن عمرؓ نے مرفوعا کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ میں اس تاویل کی دلیل نہیں جانتا۔ اس لئے کہ یہ سورت مکیہ ہے۔ اور مکہ میں عید تھی نہ فطرانہ تھا۔ امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اس کا جواب دیا ہے۔ کہ حکم سے پہلے آیت کا نزول جائز ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ لا اقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد ﴾ 1، 2 سورۃ البلد ﴾ یہ سورۃ مکیہ ہے۔ اور آپؐ پر ایک گھڑی تک قتال فتحِ مکہ کے دن حلال ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: میرے لئے دن کی ایک ساعت قتال جائز کیا گیا ہے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے۔ مذکورہ آیت میں حل کے تین معانی پائے جاتے ہیں۔ الحلول سے حل کا معنی ہے۔ کسی مقام پر اترنا۔ اس طرح آپ کا مکہ میں نازل ہونا آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ آپ کی قسم اٹھانا بھی آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ آپ کی قسم اٹھانا بھی آپؐ کے لئے میں قتال جائز کیا جائے گا۔ تیسرا معنی یہ

ہے کہ مستقبل میں آپ اس حرمت والے شہر میں نازل ہونے والے ہیں۔اس آخری رائے کے مطابق ان آیات کا نزول حرمت سے پہلے شمار ہوگا۔اسی طرح سورۃ القمر کی آیت نمبر 45 مکہ میں نازل ہوئی ﴿سیھزم الجمع ویولون الدبر﴾ حضرت عمرؓ نے کہا ہے۔میں نہیں سمجھا تھا کہ کونسی فوج شکست کھائیگی۔ جب غزوۂ بدر ہوا تو میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:﴿سیھزم الجمع ویولون الدبر ﴾جلد ہی کفار کی فوج شکست کھا جائے گی اور پیٹھ پھیر جائے گی۔

(ایک ہی شخص کے بارے میں کئی دفعہ آیت کا نازل ہونا)

اس کی مثال وہ ہے جو امام بخاری نے ،الادب المفرد، میں سعد بن ابی وقاصؓ کی سند سے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک عنوان کے تحت بیان کی ہے۔حضرت سعدؓ نے کہا ہے۔ میرے بارے میں کتاب اللہ میں چار آیات نازل ہوئی ہیں۔

(1) میری ماں نے قسم اٹھائی تھی کہ جب تک تو محمدؐ سے الگ نہیں ہوتا میں کچھ نہ کھاؤں پیوں گی۔تو اللہ نے سورۂ لقمان کی آیۂ نمبر 15 نازل فرمائی۔﴿وان جاھداک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا﴾ اگر وہ دونوں (ماں باپ) تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو نہ جانتے ہوئے میرے ساتھ کسی کو شریک کردے۔تو (اس کے بارے میں) تو ان کی پیروی نہ کر باقی دنیوی خدمت میں بھلے طریق سے ان کا ساتھ دے،دوسری آیت یہ کہ مال غنیمت میں سے میں نے ایک تلوار پکڑی تو وہ مجھے بہت اچھی لگی۔میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسولؐ!مجھے یہ تلوار عطا کردیں اس پر سورۃ الانفال کی آیۂ نمبر 1 نازل ہوئی:﴿یسئلونک عن الانفال﴾ وہ آپؐ سے مال غنیمت سے کچھ مانگتے ہیں۔تیسری آیت یہ کہ میں بیمار ہوا۔رسول اللہؐ (میری عیادت کے لئے) تشریف لائے۔میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسولؐ!میں اپنا مال تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔کیا میں نصف مال کی وصیت کردوں؟ آپؐ نے فرمایا:نہیں،پھر میں نے تیسرے حصے کی بات کی تو آپؐ خاموش ہوگئے۔لہذا بعد میں وصیت کے لئے مال کا تیسرا حصہ جائز قرار پایا۔چوتھی آیت یہ کہ میں نے لوگوں کے ساتھ شراب پی۔تو ان میں سے ایک آدمی نے اونٹ کا جبڑا میری ناک پر مارا۔میں رسول اللہؐ کے پاس آیا تو اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت نازل فرمائی۔اسی طرح حضرت عمرؓ کی تائید میں بھی کئی آیات نازل ہوئی ہیں۔(تعلیم وتربیت کے میدان

میں اسباب نزول کی معرفت کے فائدے لکھئے۔

الجواب:۔ اسباب نزول کی معرفت سے طلبہ کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ ان کے قوائے عقلیہ کو تقویت ملتی ہے ۔ان سے فہم قرآن کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ جن آیات کے نزول کا کوئی سبب بیان ہوتا ہے۔ ان کی تفسیر و تحقیق کا ان میں جذبہ ابھرتا ہے۔ اس طرح انہیں اسرار و احکام شریعت کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

السوال: آیات اور سورتوں کے درمیان مناسبات پر نوٹ لکھئے۔

الجواب:۔ آیات اور سورتوں کے درمیان ربط و تعلق کی معرفت سے قرآن فہمی میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ آیات اور سورتوں کے آپس میں ربط و تعلق کی معرفت سے قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا ادراک ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ ھود کی آیۃ نمبر 1 ہے۔ ﴿ قرآن احکمت آیاته ثم فصلت من لدن حکیم خبیر ﴾ (یہ ایسی) کتاب ہے جس کی آیات مضبوط کی گئی ہیں ایک حکمت والی خبر دار ذات کی طرف سے۔ اجزائے کلام کے ایک دوسرے کے ساتھ مناسب ربط و تعلق کی مثال ایسی ہے جیسے کسی عمارت کو مضبوطی کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہو۔ آیات قرآن کے ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط سے پوری سورۃ ایک اکائی (وحدت) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ مناسبت آیات توفیقی امر نہیں ہے۔ بلکہ یہ مفسر کے اجتہاد سے تعلق رکھتا ہے۔ جب مناسبت اور ربط و تعلق عربی علوم کے لغوی اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ تو کلام لطیف اور مقبول ہوتا ہے۔ مفسر کے لئے ضروری نہیں کہ ہر آیت کی تلاش کرتا پھرے۔ اس لئے کہ قرآن کریم حالات و واقعات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ اس لئے سابق آیات کے ساتھ کسی آیت کا ربط و تعلق اور مناسبت ضروری نہیں ہے۔ ہر آیت کی مناسبت تلاش کرنا بلاوجہ تکلف کے زمرے میں آئے گا۔ اگر مختلف اسباب کی بناء پر آیات نازل ہوئی ہوں تو ان میں ربط و تعلق کا ہونا مشروط نہیں ہے۔ قرآن کریم کچھ اوپر تئیس سالوں میں مختلف حالات و واقعات سے متعلق احکام و مسائل کی وضاحت کے لئے نازل ہوتا رہا ہے۔ اس لئے آیات کا آپس میں ربط و تعلق اور مناسبت کی جستجو سعی لا حاصل ہے۔ البتہ بعض آیات میں مناسبت واضح ہوتی ہے۔ جیسے منافقین کی صفات کے بعد مخلص مؤمنین کی صفات، آیات عذاب کے بعد آیات رحمت کا نزول، کفار کو دھمکی کے بعد ایمانداروں سے انعامات کا وعدہ وغیرہ۔ کبھی مناسبت مخاطبین کے حالات کے پیش نظر بھی ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ الغاشیۃ کی

آیات نمبر 17، 18، 19 اور 20: ﴿افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت . والی السمآء کیف رفعت . والی الجبال کیف نصبت . والی الارض کیف سطحت ﴾ اہلِ عرب کا ان چاروں چیزوں سے خاص تعلق تھا۔ اونٹ ان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ آسمان سے پانی برسنے سے انہیں زندگی ملتی تھی۔ دشمن سے بچاؤ کے لئے پہاڑوں پر پناہ لیتے تھے اور پہاڑوں کے درمیان وادیوں میں اپنے جانوروں کو چراتے تھے۔ ان کے سامنے ان چیزوں کا ذکر کر کے ان کو سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کہ جس ذات نے مذکورہ چار چیزوں کی تخلیق کی ہے۔ اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اس نے جو کتاب تم پر نازل کی ہے اس سے نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے؟ اسی طرح سورۃ الفیل کے بعد لایلاف کے نزول میں بھی ربط ومناسبت آسان ہے۔ قریش کے سامنے ہاتھیوں کی فوج کو تہس نہس کرنے سے قریش کی عزت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عرب اور اس کے ماحول میں تجارتی قافلوں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ مگر جب کسی مزاحمت کے بغیر اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی حفاظت کی۔ جس کے ساتھ قریش کا قدیمی تعلق تھا۔ تو سردی وگرمی کے موسم میں ان کے تجارتی سفر محفوظ رہو گئے۔ لایلاف قریش میں یہ احسان یاد دلایا گیا ہے۔ کہ جس رب نے ہاتھیوں کے لشکر کو برباد کر کے اس گھر (بیت اللہ) کی حفاظت کی تھی۔ تمہیں اسی کی خالص عبادت کرنی چاہیے۔ جس نے تمہیں خوف کی بجائے امن سے اور فاقہ کشی میں کھلے رزق سے نوازا ہے۔ کبھی دو سورتوں کے درمیان مناسبت ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ الانفال کا افتتاح الحمد اللہ الذی سے ہوا اور سورۃ زمر کے اختتام پر ارشادِ باری ہے ﴿وقضی بینهم بالحق وقیل الحمد لله رب العالمین . 75۔ زمر﴾ سورۃ القصص کی آیت نمبر 17 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے ﴿قال رب بما انعمت علی فلن اکون ظهیرا للمجرمین ﴾ اے میرے رب! تو نے مجھ پر احسان کیا ہے اس کی وجہ سے (اب) میں ہرگز مجرمین کا مددگار نہیں بنوں گا۔ اس سے پہلے وہ اپنے ایک اسرائیلی مجرم کی مدد میں ایک فرعونی کو قتل کر بیٹھے تھے۔ اور مدین میں شعیب علیہ السلام کی پناہ میں آ گئے تھے۔ یہاں انہیں شعیب علیہ السلام کی دامادی کا شرف حاصل ہوا اور یہیں سے جاتے ہوئے انہیں نبوت ورسالت سے نوازا گیا تھا۔ حق مہر میں انہوں نے شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائی تھیں۔ اسی سے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے یہ شعر کہا تھا:

با اگر کوئی شعیب آئے میسر : شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

پھر سورۃ القصص کے خاتمے پر اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے۔ کہ قریش مکہ نے آپ کو مکہ سے نکالا ہے۔ تو فکر نہ کریں۔ میں جلد آپ کو مکہ میں لاؤں گا۔ سو آپ بھی کافروں کے مددگار نہ بنئے۔ یہ ذکر سورۃ القصص کی آیات نمبر 85 اور نمبر 86 میں ہے۔ جس ذات نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے۔ وہ آپ کو دوبارہ اسی جگہ (مکہ) میں لوٹائے گا۔ کہہ دیجئے : میرا رب ہی جانتا ہے۔ اُسے جو ہدایت یافتہ ہے اور جو کوئی گمراہی میں ہے۔ آپ کو امید نہیں تھی۔ کہ آپ پر کتاب نازل کی جائے گی۔ مگر (یہ تو) تیرے رب کی رحمت ہے۔ لہذا آپ کافروں کے مددگار نہ بنئے۔ یہ سورۃ القصص کی افتتاحی اور اختتامی آیات میں مناسبت کی مثال ہے۔ جو شخص تفسیر قرآن کی کتابوں میں غور وفکر کرتا ہے۔ وہ بہت سی مناسبات کا ادراک حاصل کرتا ہے۔

السوال :۔ نزولِ قرآن پر مفصل نوٹ لکھیے۔

الجواب :۔ پہلا نزول ماہ رمضان کی لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے آسمانِ دنیا کے بیت العزۃ میں ہوا ہے۔ آسمانی فرشتوں کو بتایا گیا کہ جس امت پر اس کا نزول ہوا ہے۔ وہ خیر امۃ کے لقب سے مشرف ہے۔ رسول اللہ ؐ کیلئے مناسب یہی تھا کہ ان پر حالات وواقعات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن نازل کیا جاتا۔ تاکہ بتدریج امتِ مسلمہ کی تربیت ہوتی۔ اگر بیک وقت پورا قرآن نازل کیا جاتا تو مخاطب امت اس کی پیروی نہ کر سکتی۔ البتہ ماہِ رمضان کی لیلۃ القدر میں بیک وقت پورے قرآن کا نزول بیت العزۃ میں ہوا ہے۔ سورۃ القدر کی آیۃ 1 سورۃ البقرۃ کی آیۃ نمبر 184 میں اور سورۃ الدخان آیت نمبر 33 میں اس کے نزول سے ایک رات کو ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ اور سورۃ الدخان میں اس رات کو لیلۃ مبارکۃ کہا گیا ہے۔ ان تینوں آیات میں کوئی تناقض نہیں اور معنوی سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ ان تینوں آیات میں کوئی تناقض اور معنوی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ تینوں سے نزولِ قرآن ہی مُراد ہے۔ اس بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں :۔

(1) ابن عباسؓ اور جمہور علماء کا مذہب ہے کہ ان تینوں آیات میں بیک وقت پورے قرآن کے نزول کا ذکر ہے۔ اس کے بعد حالات وحوادث کے مطابق تیئس سالوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا ہے۔ رسول اللہ مکہ مکرمہ میں بعثت کے بعد تیرہ سال اور مدینہ منورہ

میں دس سال تک مقیم رہے۔ اور تریسٹھ (63) سال کی عمر میں آپ فوت ہوئے۔ اس مذھب کے بارے میں ابن عباسؓ کی کئی صحیح روایات وارد ہیں۔ جن میں ایک ہی جامع روایت پر اکتفا کی جاتی ہے۔ عن ابن عباسؓ قال: انزل القرآن جملۃ واحدۃ الی السماء الدنیا لیلۃ القدر ثم انزل بعد ذالک فی عشرین سنۃ ثم قرأ ﴿ولا یاتونک بمثل الا جئناک بالحق واحسن تفسیرا ۔ 33 الفرقان﴾ ﴿وقرآنا فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث ونزلناہ تنزیلا ۔ 106 الاسراء﴾ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے: کہ قرآن پورے کا پورا یک وقت لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ پھر آپؐ نے سورۃ الفرقان کی آیۃ نمبر 33 پڑھی ﴿ کہ کافر آپؐ کے سامنے جو مثال بھی بیان کریں گے ہم اس کے مقابلے میں حق کو بہترین تفسیر کے ساتھ بیان کریں گے۔ پھر آپؐ نے سورۃ الاسراء کی آیت نمبر 106 کی تلاوت کی۔ اور قرآن کو ہم نے جدا جدا نازل کیا ہے۔ تاکہ آپ ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو وہ پڑھ کر سنائیں۔ اور ہم نے اُسے بتدریج نازل کیا ہے۔ اہلِ کفر کا اعتراض تھا کہ پہلی آسمانی کتابوں کی طرح قرآن بھی پورے کا پورا یک وقت کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ تدریجاً نازل کرنے میں یہ حکمت تھی کہ قرآنِ کریم پہلی تمام آسمانی کتابوں کے حقائق کو بھی شامل ہے۔ نیز اس کے ذریعے دین کی تکمیل مراد تھی۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کی آسانی کے لئے اور تمام احکام شریعت پر عمل کی سہولت کیلئے اسے حالات وحوادث کیمطابق قسط وار نازل کیا گیا۔ کہ یک وقت تمام احکام شریعت پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔ اسلئے کہ امتِ دعوت ایک طویل عرصے تک اخلاقی رذالتوں میں مبتلا رہی تھی۔ حضرت عائشہؓ کی بخاری میں ایک روایت وارد ہے کہ اگر شراب وزنا سے فوراً نہیں منع کیا جاتا تو وہ انکار کر دیتے۔ اس لئے آہستہ آہستہ ان کی تربیت اور تزکیہ کر کے بعض اخلاقی برائیوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو ماہ ربیع الاول سے لیکر چھ ماہ تک سچے خوابوں سے وحی کی ابتداء کی گئی۔ پھر بیداری کی حالت میں وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسرا مذہب شعبی سے روایت کیا گیا ہے۔ کہ تینوں آیات میں رسول اللہؐ پر نزولِ قرآن کی ابتداء کا ذکر ہے۔

تیسرے مذہب کے دلائل بھی صحیح ہیں اور ان کا ابن عباسؓ کے مذہب سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قابلِ ترجیح یہ امر ہے کہ قرآنِ کریم دو طرح نازل ہوا ہے۔ ایک دفعہ لوحِ محفوظ سے پورے کا پورا یک وقت بیت العزۃ میں نازل ہوا اور دوسری دفعہ حالات وحوادث کے مطابق

تحیس سالوں میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا ہے۔ جس طرح ستارے اپنے اپنے وقت پر ایک دوسرے کے پیچھے ظاہر ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایک دفعہ پورے قرآن کو نازل کیا پھر تھوڑا تھوڑا کر کے اسے نازل کرتا رہا اس سے نبی آدم کی عزت و تکریم مطلوب تھی۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں بنی آدم اور خصوصاً خیر المرسلین سرورِ کونین محمد مصطفےٰ ﷺ کی عظمتِ شان کو ظاہر کیا۔ ستر ہزار فرشتوں کو سورۃ الانعام کے ساتھ بھیجا کہ تم جا کر یہ سورۃ بیت العزۃ تک پہنچاؤ۔ اور جبریل امین کو حکم دیا کہ قرآن کریم لکھنے والے مقرب فرشتوں کو املا کراؤ۔ اور ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو۔

السوال:۔ بتدریج نزولِ قرآن پر مختصر نوٹ لکھئے۔ نیز اس کی حکمت تحریر میں لائیے۔

الجواب:۔ سورۃ الشعراء کی آیات نمبر 192، 193، 194 اور 195 میں قرآنِ کریم کے بتدریج نازل ہونے کا ذکر ہے۔ ﴿وانہ لتنزیل بلسان عربی مبین﴾ اور بیشک وہ (قرآنِ کریم) رب العالمین کی طرف سے آہستہ آہستہ نازل کیا گیا ہے۔ اسے جبریلِ امین لیکر نازل ہوئے (اسے) آپؐ کے دل پر نازل کیا گیا تاکہ آپؐ (لوگوں کو اللہ کے عذاب سے) ڈرائیں۔ (اور یہ) واضح فصیح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ سورۃ النحل کی آیہ نمبر 102 میں منجما نازل ہونے کی حکمت بیان کی گئی ہے۔ ﴿قل نزلہ روح القدس من ربک بالحق لیثبت الذین آمنوا وھدی وبشری للمسلمین﴾ (اے نبیؐ) کہہ دیجئے (اس قرآن کو) آپؐ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ جبریلِ امین نے نازل کیا ہے۔ (آہستہ آہستہ) تاکہ ایمانداروں میں عملی مضبوطی پیدا کرے اور مسلمانوں کے لئے (قرآنِ کریم) ہدایت اور خوشخبری سراپا ہے۔ مختلف آیات میں قرآنِ کریم کے بتدریج نازل ہونے کا ذکر ہے اور واضح کیا گیا ہے۔ کہ قرآنِ کریم عربی الفاظ کیساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ انزل کی بجائے تنزیل کا مصدر استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم ہے کسی چیز کو درجہ بدرجہ نازل کرنا۔ انزال کے مفہوم میں تدریج نہیں ہے۔ پھر عربی زبان میں قرآنِ کریم جیسی کوئی سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے۔ جس سے پورے عرب کے فصحاء و بلغاء عاجز آ گئے تھے۔ اور جس احمق نے بھی کچھ اوٹ پٹانگ الفاظ کی گھڑنت کی اس کی موقعہ پر ہی خود فصحاءِ عرب نے درگت بنا دی۔ مثلاً ایک احمق نے دعویٰ کیا کہ میں سورۃ الفیل کی طرح کی سورت بنا سکتا

ہوں۔لوگوں نے کہا: سنا! اُس نے سنایا۔ الفیل ما الفیل ، له ذنب قصیر و خرطوم طویل ۔ ہاتھی۔کیا ہے ہاتھی؟ اس کی دم چھوٹی اور سونڈ لمبی ہے۔ سننے والوں نے اس کی ایسی درگت بنائی۔ کہ وہ بے حد شرمندہ و ذلیل ہوا۔انہوں نے کہا سورۃ الفیل میں تو ایک تاریخی واقعہ کا ذکر کر کے توحید الٰہی کی طرف دعوت دی گئی اور اس میں بہت بڑا درسِ عبرت اس میں نہیں ہے۔ ہاتھی کو جو بچہ بھی دیکھے گا اُسے یہی کچھ نظر آئے گا۔ جو تو نے انکشاف کیا ہے۔

قرآن مکہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے تیرہ سالوں میں نازل ہوا۔اور مدینہ منورہ میں دس سال تک نازل ہوتا رہا۔سورۃ الاسراء کی آیۃ :106 میں بتدریج نزولِ قرآن کی حکمت بیان کی گئی ہے ﴿وقرآنا فرقناه لتقرأه على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا﴾ اہلِ کفر کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ توراۃ انجیل کی طرح قرآن کو بیک وقت اکٹھا کیوں نازل نہیں کیا۔اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا۔﴿لنثبت به فؤادك﴾ تا کہ آہستہ آہستہ نازل کر کے ہم آپؐ کے دل کو مضبوط کر دیں۔ یہ اعتراض بھی ایک آدمی کی بجائے فرشتہ کیوں مبعوث نہیں کیا گیا۔ یہ تو ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں آتا جاتا ہے۔فی الحقیقت مشرک دماغی خلل میں مبتلا ہوتا ہے۔ سفر میں زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو آٹے کے بنے ہوئے خدا کو توڑ کر کھا لیتا ہے اور اس کی جگہ کسی پتھر کو خدا بنا لیتا ہے۔اس سے بڑھ کر دماغی خلل اور کیا ہو سکتا ہے؟

بتدریج نزولِ قرآن کی حکمتیں۔

(1) رسول اللہؐ کے دل کو مضبوط کرنا۔ چونکہ رسول اللہؐ دل سوزی کیساتھ امتِ مخاطبہ کو پیغام خدا پہنچاتے تھے۔مگر کفار کی گھٹی میں انکار و جفا داخل تھی۔اس لئے آپؐ کا دل بہت کڑھتا تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دیں۔تو سورۃ الکھف کی آیت نمبر 6 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپؐ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے؟ آپؐ سے پہلے انبیاء کو بھی بہت ستایا گیا تھا۔مگر انہوں نے صبر کیا۔اسی طرح آپؐ پر وحی وقفے وقفے سے نازل ہوتی تھی۔کہ آپؐ کے دل کو تقویت حاصل ہو۔قرآنِ کریم آپ کو صبر کی تلقین کرتا ہے جس طرح آپؐ سے پہلے اولو العزم رسولوں نے صبر کیا تھا۔

دوسری حکمت:

انہیں قرآن کی طرح کوئی سورۃ پیش کرنے کا چیلنج اور ان (کفار) کا عاجز آنا۔کفار آپؐ سے

عجیب وغریب سوالات کرتے تھے۔کبھی قیامت کے قائم ہونے کا وقت پوچھتے تھے۔کبھی عذاب آنے کی جلدی مچاتے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کے ہر سوال کا مُسکِت جواب نازل فرماتے تھے۔انہوں نے تنجیم کے ساتھ قرآن کے نزول پر اعتراض وتعجب کیا۔تو تنجیم کے باوجود وہ چیلنج کا جواب نہ دے سکے تو یہ امر بھی قرآن کے اعجاز میں واخل ہوا۔

تیسری حکمت:

قرآنِ کریم کے حفظ اور اس کے فہم کی آسانی مہیا کرنا۔

قرآنِ کریم ایسی ان پڑھ امت پر نازل کیا گیا ہے جو پڑھنا جانتی تھی نہ لکھنا۔کہ وہ قرآن کو لکھ کر یاد کر لیتی۔انہیں حافظے اور یادداشت کی بے بہا خوبی حاصل تھی۔اس لئے پورا قرآن نازل ہو جاتا تو ان کے لئے حفظ کرنا محال تھا۔

چوتھی حکمت:

ان احوال وحوادث کے ساتھ ساتھ چل کر ان کا حل پیش کرنا اور شرعی احکام میں آہستہ آہستہ عملی پختگی پیدا کرنا۔اگر قرآنِ کریم کے اخلاقی رذائل کا علاج حکمت کے ساتھ نہ کرتا تو ان کی اخلاقی بیماریوں کا ازالہ نہ ہو سکتا۔بلکہ ان کا مزاج طبعی طور اور زیادہ بگڑ جاتا۔اس لئے جب بھی کوئی واقعہ پیش آتا تھا۔تو اُس سے متعلق شرعی حکم نازل ہو جاتا تھا۔اگر ان کی روحانی بیماریوں کے ازالے کی یک لخت کوشش کیجاتی تو یہ امر محال تھا۔جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی بخاری میں ایک حدیث وارد ہے۔اس لئے قرآنِ کریم نے پہلے انکے عقائد کی اصلاح کی۔مکی زندگی میں زیادہ زور اصلاح عقائد پر ہی دیا گیا ہے۔اس دور میں نماز روزہ حج وزکوٰۃ کے احکام نازل نہیں کیے گئے۔عمدہ اخلاق کا انہیں حکم دیا گیا۔اور فحشاء ومنکرات سے ان کے اذھان کو پاک کیا گیا۔پھر ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں احکام شریعت وضع کئے گئے۔مدنی (شہری زندگی) کے اصولِ معاملات مکی زندگی میں پیش کئے گئے اور ان کے تفصیلی احکام مدینہ منورہ کی زندگی میں وضع کئے گئے۔

زنا اور شراب کے نقصان کو مکی زندگی میں بیان کیا گیا۔پھر قطعی حرمت کو مدینہ منورہ میں نازل کیا گیا۔تدریج کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث بخاری میں وارد ہے: جو اس تدریجی حکمت کو واضح کرتی ہے۔قالت: انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار . حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام .

ولو نزل اوّل شیء ، لاتشربوا الخمر ، لقالوا الاندع الزنا ابدا ،شروع میں مفصل کی سورت میں جنت اور جہنم کا ذکر کیا گیا۔ جب لوگ اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ (اور ان کے عقائد درست ہو گئے) تو حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر شروع ہی میں یہ حکم نازل ہوتا۔ شراب نہ پیو۔ تو لوگ کہتے: ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اس حدیث میں تدریجی نزولِ قرآن کی بھرپور وضاحت ہے۔ اخلاقی مفاسد کا تدریج کے ساتھ ازالہ کیا گیا ہے۔

پانچویں حکمت:

قطعی دلالت کا اظہار کہ قرآنِ کریم حکمت والے تعریف والے اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات وقفے وقفے کے بعد نازل ہوتی رہیں یہ سلسلۂ نزول کچھ اوپر بیس سال تک جاری رہا۔ آیات کی ترتیب واسلوب ایسا نرالا ہے۔ جس کی مثال کلامِ بشر میں نہیں پائی جاسکتی۔ سورۂ ھود کی پہلی آیت میں یہ ذکر ہے ﴿کتاب اُحکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر﴾ (یہ ایسی) کتاب ہے جس کی آیات مضبوط ہیں (ان میں کوئی خامی نہیں ہے) پھر ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ (اور یہ تفصیل) حکمت والے خبردار (اللہ) کی طرف سے کی گئی ہے۔ (اس میں کسی بشر یا فرشتے کا کوئی دخل نہیں ہے) قرآنِ کریم کے بعد رسول اللہ ﷺ کی احادیث فصاحت وبلاغت کی انتہائی بلندی پر فائز ہیں۔ کسی بشر کا کلام رسول اللہؐ کے کلام کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ قرآن کے منجماً نزول سے تعلیم وتربیت کا بہترین کام کیا گیا ہے۔ تعلیم وتربیت کا دارومدار دو بنیادی امور پر ہے۔

(1) طالبعلموں کے ذہنی معیار کا خیال رکھنا۔

(2) انکی صلاحیتوں اور نفسانیت کی صحیح خطوط پر نشوونما کرنا۔ قرآنِ کریم کے بتدریج نزول میں ان دونوں بنیادی امور کا خیال رکھا گیا ہے۔ ابتدائی وحی میں پڑھنے لکھنے کے ذریعہ (قلم) کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ القلم کی آیات نمبر ایک تا پانچ میں یہ تذکرہ ہے۔ پھر مالی نظام میں آیاتِ ربا اور المواریث نازل کی گئی ہیں۔ پھر اسلام اور شرک میں جدائی کے لئے آیاتِ قتال کا نزول ہوا۔ اسی طرح حالات وحوادث کے مطابق قرآن کا نزول ہوا ہے۔ اور اس میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ جس میدانِ تربیت وتعلیم میں مذکورہ بالا دو بنیادی امور کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کا طریقِ تعلیم وتربیت بالکل ناکام ہوتا ہے۔

(جمع القرآن وترتیب)

السوال:۔قرآن کو جمع کرنے اور اس کی ترتیب پر مفصل نوٹ قلم بند کریں۔

الجواب:۔قرآن کو جمع کرنے کے دو مفہوم ہیں۔ایک حفظ کے ذریعے۔دوسرا کتاب کے ذریعے۔پہلا مفہوم قرآن کے حفاظ کے سینوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ابن عباسؓ کہتے ہیں: رسول اللہؐ قرآن کی تنزیل سے بہت تکلیف اٹھاتے تھے۔آپؐ اپنی زبان اور ہونٹوں کو حرکت دیتے تھے۔ مبادا قرآن زبان پر نہ چڑھے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ القیامۃ کی آیات 16، 17، 18، اور 19 میں فرمایا: آپؐ اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔تاکہ اسے جلدی یاد کرلیں۔اُسے جمع کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ہمارے ہی ذمہ ہے۔یعنی ہمارا ہی ذمہ ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینہ میں جمع کردیں۔پھر ہم اس کی قرآءۃ کریں گے۔سو جب ہم اُسے پڑھیں (یعنی جب ہم اُسے آپؐ پر نازل کریں تو اس کی قرآءۃ کی پیروی کریں۔(اُسے سنئے اور خاموش رہئے) پھر ہمیں پر اس کی وضاحت کرنا ہے۔اس کے بعد جب جبریل چلے جاتے تو آپؐ اللہ کے وعدے کے مطابق اسے پڑھ لیتے تھے (بخاری مسلم)

قریش مکہ ان پڑھ تھے مگر فطری طور پر ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔چنانچہ درج ذیل سات اصحاب نے حافظے کی قوت سے قرآن کریم کو اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا تھا۔(1) عبداللہ بن مسعودؓ (2) ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام سالم بن معقلؓ (3) معاذ بن جبلؓ (4) ابی بن کعب، ان چاروں میں دو مہاجر اور دو انصاری تھے۔(5) زید بن ثابتؓ، (6) ابو درداء اور ابوزید انصاری، ان ساتوں نے پورا قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا تھا۔ان کے علاوہ اور صحابہؓ نے بھی قرآن حفظ کیا تھا۔مگر مذکورہ بالا سات اصحاب کی طرح پورا قرآن ان کے سینوں میں محفوظ نہیں تھا۔کچھ صحابہؓ نے بغیر نبیؐ کے کھجور کی شاخوں کے سفید حصوں، چپٹے سفید پتھروں، پالان کی چپٹیوں، چمڑے کے ٹکڑوں اور چھوٹے چھوٹے رقعوں پر قرآن کو لکھ رکھا تھا۔وہ قوت حافظہ سے قرآن کو سینوں میں محفوظ کرنے سے قاصر تھے۔عام طور پر رسول اللہ قرآن کو لکھواتے نہیں تھے۔مبادا کوئی آیت منسوخ ہوجائے۔دوسری جمع وترتیب پورے قرآن کی کتابت کے ساتھ تھی۔مگر سورتیں اور آیات جدا جدا تھیں۔آپس میں مربوط نہیں تھیں۔قرآن کریم عہد نبیؐ میں زیادہ تر سینوں میں حفظ کے ذریعے موجود تھا۔نبی قرآنی وحی کا شوق سے انتظار کرتے تھے۔نزول کے بعد اسے سمجھ کر یاد کرلیتے تھا۔نبی قرآنی وحی کا

شوق سے انتظار کرتے تھے۔نزول کے بعد اسے سمجھ کر یاد کر لیتے تھے۔اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق نبیؐ کو یاد کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔ اہلِ عرب کو فطری طور پر زبردست قوت حافظہ عطا کی گئی تھی۔امام بخاری رحمہ اللہ درج ذیل سات حفاظ قرآن سے تین صحیح روایات کی ہیں۔عبداللہ بن مسعودؓ، ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم بن معقلؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابت، ابو زید بن السکن اور ابو درداء، حدیث، عبداللہ بن عمرو ابن العاص نے کہا ہے: میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔کہ چار صحابہؓ سے قرآن حاصل کرو۔دوسری اور تیسری حدیث میں بھی اسی طرح کا ذکر ہے۔ان تینوں حدیثوں میں معنوی لحاظ سے کوئی تعارض اور اختلاف نہیں ہے۔(رواہ البخاری) سات یا آٹھ صحابہؓ کے ذکر سے یہ مراد نہیں ہے۔بلکہ تمام صحابہؓ قرآن حفظ کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے۔اور اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کو بھی یاد کرواتے تھے۔مگر جن سات یا آٹھ صحابہؓ کا احادیث میں ذکر ہے۔انہوں نے حفظِ قرآن کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ان کے سینے میں پورا قرآن محفوظ تھا۔اور ان کی اسناد ہم تک پہنچی ہیں۔حضرت انسؓ کا کہنا کہ چار انصاریوں ہی نے قرآن جمع کیا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت انسؓ ان چار انصاریوں کے علاوہ کسی کو نہیں جانتے تھے۔(الماوردی نے یہ ذکر کیا ہے) ابو عبید قاسم بن سلام الھروی الازدی نے اپنی کتاب، القراءات، میں قرآن حفظ کرنے والے درج ذیل نام دیئے ہیں۔چاروں خلفاء راشدین، طلحہؓ، سعدؓ، ابن مسعودؓ، حذیفہؓ، سالم، ابو ھریرہؓ، عبداللہ السائب، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو ابن العاص، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن الزبیرؓ، انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے پورا قرآن بھی حفظ کیا تھا۔اس لئے کہ تواتر کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ پورے کا پورا قرآن سینے میں محفوظ کر لیا گیا ہو۔جن قاریوں کی اسناد ہم تک نہیں پہنچی ان کی تعداد بھی بہت ہے۔ابن الجزری نے کہا ہے کہ بغیر کتابت کے قرآنِ کریم کا محفوظ ہونا اور کرنا اس امت کی خصوصیت ہے۔جو کسی امتِ سابقہ میں نہیں پائی جاتی۔یہود و نصاریٰ میں کوئی بھی توراۃ و انجیل کا حافظ نہیں ہے۔

(ب) عہدِ رسولؐ میں کتابت کے ساتھ قرآن کی حفاظت:۔

رسول اللہؐ نے کتابتِ وحی کیلئے جلیل القدر صحابہؓ سے خدمت لی ہے۔جیسے حضرت علیؓ، معاویہؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابت، آیت کے نازل ہونے پر آپؐ انہیں لکھنے کا حکم دیتے

تھے۔ اور اس آیت کے مقام پر رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ اس طرح تحریری طور پر بھی قرآنِ کریم کو جمع کیا گیا۔ موجودہ دور کے وسائل کتابت انہیں حاصل نہ تھے۔ تاہم انہوں نے بڑی مشقت کے ساتھ مختلف غیر قابل تحریر چیزوں پر قرآنِ کریم کو لکھ کر جمع کیا۔ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جبریل امین رمضان کی ہر رات میں آ کر رسول اللہؐ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے۔ عہدِ نبیؐ میں حفظ کے ذریعے سینوں میں اور کتابت کے ذریعے مختلف چیزوں پر قرآنِ کریم جمع ہو چکا تھا۔

(2) عہدِ ابوبکرؓ میں جمعِ قرآن: ۔ جنگ یمامہ اور بئر معونہ پر جب ایک سو چالیس قرآء قرآن شہید ہو گئے۔ تو حضرت عمرؓ نے خلیفۃ الرسولؐ سے رجوع کر کے اصرار کیا کہ مزید غزوات میں اور بھی قرآء کے شہید ہونے کا احتمال ہے۔ اس طرح قرآن کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہذا آپؓ قرآنِ کریم کی مصحف میں تحریر کا حکم صادر فرمائیں پہلے تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کا انکار کیا۔ آخرکار حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کر کے زید بن ثابتؓ کے ذریعے سینوں اور تحریروں سے حاصل کر کے مصاحف لکھوائے۔ وہ سینوں میں محفوظ اور کتابت سے محفوظ قرآن کا مقابلہ کر کے مصاحف لکھتے رہے۔ پھر یہ صحیفے آپؓ کی زندگی تک آپؓ کے پاس رہے۔ اور پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی سالوں تک وہ صحیفے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے۔ کتابت سے پہلے زید بن ثابتؓ نے کہا تھا: اگر مجھے ایک پہاڑ کے ایک جگہ سے منتقل کرنے کا کام سونپا جاتا تو وہ قرآن نقل کرنے سے مجھ پر زیادہ آسان ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ سورۃ التوبۃ کی آخری آیۃ میں نے ابوخزیمہ انصاری کے پاس لکھی ہوئی پائی: اس سے مراد یہ ہے کہ یہ آیت ابوخزیمہ کے علاوہ کسی دوسرے صحابی پاس مکتوب نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ صحابہ کے سینوں میں بھی محفوظ نہیں تھی۔ مگر چونکہ زید بن ثابتؓ ہر سینے کی محفوظ آیت کا مکتوب آیت سے مقابلہ کرتے تھے۔ اس لئے یہ آیتِ مکتوبہ حضرت ابوخزیمہ انصاری ہی کے پاس پائی گئی ﴿لقد جاء کم رسول من انفسکم الی آخر سورۃ البراءۃ﴾

زید بن ثابتؓ اور حضرت عمرؓ سے ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ۔ جو شخص دو گواہ پیش کرے تو ان دونوں سے تحقیق وتثبت کے بعد اُس آیت کو لکھو۔ ہم جان چکے ہیں کہ عہدِ نبیؐ میں قرآن جمع ہو چکا تھا مگر وہ مربوط و مرتب نہیں تھا۔ جدا جدا ٹکڑوں پر مکتوب تھا۔ حضرت کے ابوبکرؓ کے حکم سے اسے مرتب اور مربوط کیا گیا۔ اس لحاظ سے حضرت ابوبکرؓ

قرآنِ کریم کے سب سے پہلے مرتب شکل میں لانے والے ہیں۔ اگر چہ صحابہؓ کے پاس انفرادی طور پر بھی مکتوب مصحف موجود تھے۔ جیسے مصحف علیؓ اور مصحف ابی بن کعب وغیرھم مگر جو خصوصیت مصحف ابی بکرؓ میں موجود تھی۔ وہ دوسرے صحائف میں نہیں تھی۔ ابو بکرؓ کے جمع قرآن کو الجمع الثانی کا نام دیا گیا ہے۔ پہلی جمع تو عہد نبی میں ہو چکی تھی۔

(3) جمع القرآن فی عہد عثمان رضی اللہ عنہ:۔

فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ قاری صحابہ مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ چونکہ قرآن کریم سات لہجوں پر نازل کیا گیا تھا۔ ہر علاقے اور ہر شہر کے لہجے میں دوسرے علاقوں کے لہجوں کی نسبت اختلاف تھا۔ اور اس اختلاف کا نتیجہ بعض اوقات لڑائی جھگڑے تک پہنچتا تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف اختلاف کی وجہ سے فتویٰ بازی شروع ہوگئی۔ تب حضرت عثمانؓ سے عرض کیا گیا امت کو سنبھالئے ورنہ یہ انتشار تباہی پر ختم ہوگا۔ تحریفِ قرآن کا اندیشہ ہوا۔ تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ سے صحیفہ ابی بکر منگوا کر قریش کے ایک ہی لہجہ پر قرآنِ کریم کو جمع کر کے تمام علاقوں اور مرکزی شہروں میں ایک ایک نسخہ بھیج دیا۔ ایک نسخہ المصحف الامام کو مدینہ منورہ میں محفوظ رکھا۔

السؤال:۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن پر نوٹ لکھیے:۔

الجواب:۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حذیفہ ابن الیمانؓ نے حضرت عثمانؓ کے پاس آ کر کہا: (وہ اہلِ عراق کے ساتھ مل کر شام کے خلاف ارمینیہ اور اُذربیجان میں لڑ رہے تھے) وہ مسلمانوں کے قراءۃ القرآن میں اختلاف فتویٰ بازی کا ذکر کر رہے تھے۔ حضرت حذیفہ کی توجہ دلانے پر حضرت حفصہؓ کو حکم دیا کہ صحائف ابی بکرؓ میری طرف بھیج دیجئے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ صحائف حضرت عثمانؓ کی طرف بھیج دیئے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیرؓ سعید ابن العاص، اور عبدالرحمان ابن الحارث کو حکم دیا تو انہوں نے قرآنِ کریم ایک ہی مصحف میں لکھا۔ حضرت عثمانؓ نے تینوں قریشیوں سے فرمایا: جب تمہارا زید بن ثابتؓ سے کتابتِ قرآن کے بارے میں اختلاف ہو جائے۔ تو قریش ہی کی زبان میں لکھنا۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم قریش ہی کی زبان اور لہجے میں نازل ہوا ہے۔ انہوں نے اسی طرح کیا اور حضرت عثمانؓ نے صحائفِ ابی بکر حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیئے۔ اور ہر مرکزی شہر کی طرف ایک ایک مصحف بھیج دیا۔ اور اس کے علاوہ مختلف لہجوں میں جتنے صحیفے تھے سب کو جلا دیا

۔زید کہتے ہیں: سورۃ الاحزاب کی آیہ نمبر 213 ہم نے خزیمہ بن ثابتؓ انصاری کے پاس پائی (لکھی ہوئی) ﴿من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ﴾ ایمانداروں میں کچھ ایسے آدمی ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا۔ اس آیت کو پھر ہم نے سورۃ الاحزاب میں شامل کر دیا۔ (رواہ البخاری)

نوعمر نوجوان اختلاف قرآءۃ کی وجہ سے ایک دوسرے کو کافر تک کہنے لگے تھے۔ یہ خبر حضرت عثمانؓ تک پہنچی تو آپؓ نے فرمایا: اے اصحاب محمدؐ! لوگوں کیلئے مصحف امام لکھو! جب کوئی اختلاف ہوتا تو اُس صحابیؓ سے اصلاح کرواتے تھے جس نے وہ حصہ قرآن براہ راست نبیؐ سے سیکھا تھا۔ اسے کسی وادی سے بلا لیتے تھے اس سے پوچھ کر وہ آیت اس کے مقام پر لکھ دیتے تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اہل امصار کی طرف لکھا۔ میں نے ایک مصحف لکھوایا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب صحائف کو ختم کر دیا ہے۔ تم بھی انہیں ختم کر دو۔ (تفسیر طبری جلد اول) حضرت علیؓ نے فرمایا ہے: کہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں خیر اور بھلی بات کہو! اللہ کی قسم، اگر عثمانؓ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ حضرت عثمانؓ نے ہمارے جلیل القدر مشورے سے ایسا کیا ہے۔ میری رائے ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی مصحف کو اختیار کریں۔ (اخرجہ ابن ابی دواود سند صحیح) حضرت عثمانؓ نے ایک ایک مصحف ہر مرکزی شہر میں بھیج دیا۔ اور مصحف امام کو مدینے میں رکھا۔ پھر امت نے اسی مصحف امام کو قبول کیا اس کے علاوہ چھ لہجوں میں لکھے ہوئے تمام صحائف کو جلا دیا گیا۔ اس لئے کہ سات لہجوں میں قرآءۃ جائز تھی واجب نہیں تھی اگر رسول اللہؐ نے انہیں واجب کیا ہوتا تو ان کا ایک ایک حرف نقل کیا جاتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ پوری امت نے حضرت عثمانؓ کی طاعت کی ہے۔ اور آج تک انہی کا جمع کردہ قرآن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہی قرآن انہی حروف کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

(ا) کہا گیا ہے کہ عثمانی مصحف کے سات نسخے تھے۔ ابن ابی داوود نے کہا ہے۔ میں نے ابو حاتم سجستانی کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ساتھ مصاحف لکھے گئے تھے۔ درج ذیل چھ علاقوں کی طرف ایک ایک مصحف بھیجا گیا تھا۔ مکہ مکرمہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، اور کوفہ، ایک مصحف امام کو مدینہ منورہ میں رکھا گیا تھا۔ مصحف کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کوئی چار کہتا ہے اور کوئی پانچ عدد کہتا ہے۔ مگر قابل ترجیح ابن ابی داوود ہی کی روایت ہے۔

☆حضرت عثمانؓ کے لکھے ہوئے مصاحف میں سے آج ایک بھی نسخہ نہیں پایا جاتا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب، فضائل القرآن، میں لکھا ہے۔ کہ انہوں نے شام کی جامع دمشق میں اونٹ کی کھال میں لکھا ہوا ایک نسخہ دیکھا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ یہ شامی نسخہ رومی حکمرانوں کے مرکزی دارالکتب لینن گراڈ سے لندن لے جایا گیا تھا۔ ایک روایت ہے کہ یہ مصحف جامع دمشق میں جلا دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

"(شبہ مردودۃ) ایک مردود شبہ، خواہش پرست لوگوں نے قرآنِ کریم کی عظمت کو داغدار کرنے کے لئے کچھ آثار وروایات سے غلط نتیجہ اخذ کر کے بکواس کی ہے۔ کہ آج جو مصحف ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں سے کچھ حصہ ساقط ہے۔ یعنی کچھ قرآنی حصہ اس میں درج نہیں۔ دلائل میں وہ درج ذیل روایات پیش کرتے ہیں۔

(ا) (بخاری ومسلم کی ایک حدیث) حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: رسول اللہؐ نے مسجد میں ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحم کرے، اس نے قرآن کی فلاں سورۃ کی فلاں فلاں آیات یاد کرادی ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔ میں انہیں ساقط کر چکا تھا۔ ایک روایت میں ہے مجھے وہ آیات بھلادی گئی تھیں۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں قریب المعنی الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ اس روایت سے ان نفس پرستوں نے یہ استدلال کیا ہے، کہ نبیؐ کچھ حصہ قرآن کو ساقط کر چکے۔ اسقاط کی دوسری روایت تعبیر کرتی ہے۔ کہ اسقاط سے مراد نسیان ہی تھا۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ موجود مصحف میں کچھ قرآن موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کو نسیان لاحق ہو گیا تھا۔ اور نبی کو نسیان کا لاحق ہونا بعید از عقل نہیں ہے۔ جب تبلیغ میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ وہ آیات آپ کو یاد تھیں اور آپؐ نے کاتبانِ وحی سے انہیں لکھوا لیا تھا ۔ انہی مکتوبات سے قرآن کو جمع کیا گیا ہے۔ اس میں شک وشبہ کی کونسی دلیل ہے۔ نہ لکھنے والے صحابہؓ نے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ان دونوں شہادتوں سے قرآنِ کریم کو جمع کیا گیا تھا۔ جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہے۔ لکھی ہوئی چیز کا بھول جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے۔ کہ وہ چیز ریکارڈ میں موجود نہیں ہے

قرآن حفظ کرنے والوں کی تعداد حدِ تواتر کو پہنچتی ہے۔ جس صحابیؓ نے نبیؐ کو وہ آیات یاد دلادی تھیں وہ بھی انہیں حفاظ قرآن میں سے ایک تھے۔

(ب) سورۃ الاعلیٰ کی آیات نمبر 7،6 ﴿سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشآء اللہ﴾ اس سے وہ کج فہم

لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ استثناء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس حصہ قرآن کو چاہے اسے بھلا دیگا یا ساقط کر دیگا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ استثناء سے اللہ نے اپنی قدرت کاملہ کا اظہار کیا ہے۔ کہ اللہ چاہے تو بھلا بھی سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نبیؐ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ آپ کی بھول چوک کی اصلاح اور آپ کو قرآن حفظ کرانے کا ذمہ دار ہے۔ یہ کہاں سے ثابت ہوا؟ کہ اللہ نے فی الواقع قرآن کا حصہ نبی کو مستقل طور پر بھلا دیا یا ساقط کر دیا ہے۔ جو شخص کتاب اللہ پر سچا ایمان رکھتا ہے۔ اور صاحب شریعت ﷺ کی قدر جانتا ہے۔ وہ ایسی در فنطنی اور بکواس نہیں کر سکتا۔

(2) وہ ابن مسعودؓ کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس میں ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ امام نووی نے "شرح المھذب" میں کہا ہے کہ مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ معوذتین اور سورۃ الفاتحہ قرآن کا حصہ ہیں۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ ابن مسعودؓ سے منسوب روایت جھوٹی اور من گھڑت ہے۔ ممکن ہے کہ ابن مسعودؓ نے رسول اللہؐ سے معوذتین کے بارے میں نہ سنا ہو۔ تو ان کے بارے میں توقف سے کام لیا ہو۔ نیز ابن مسعودؓ کا انکار اجماع امت کے خلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابن مسعودؓ کے صحیفے میں سورۃ الفاتحہ شامل نہیں ہے۔ حالانکہ سورۃ الفاتحہ ام القرآن ہے۔ اور اس کا قرآن ہونا کسی پر مخفی نہیں ہے۔

(3) غالی شیعہ کا دعویٰ ہے کہ ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنھم نے قرآن میں تحریف کی ہے۔ اور بعض آیات کو قرآن سے خارج کر دیا ہے۔ سورۃ الاحزاب سے اہل بیت کے فضائل پر مشتمل آیات انہوں نے ساقط کر دی ہیں۔ (لعن اللہ الشیعۃ الغالیۃ) ان اقوال کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ ان کے سینکڑوں بدعقائد کی طرح مذکورہ بالا دعویٰ بھی خالص بکواس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے بارے میں ابوبکرؓ تمام لوگوں سے زیادہ عظیم اجر کے مستحق ہیں۔ وہ قرآن کو سب سے پہلے جمع کرنے والے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے بارے میں جو خبیث، حراق القرآن، کا لقب دیتے ہیں انہیں اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ عثمانؓ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اگر عثمانؓ ایسا نہ کرتے تو اختلاف قرآءۃ کی وجہ سے سب مسلمان ایک دوسرے کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتے۔ اور مسلمانوں کے انتشار وافتراق میں سنگین اضافہ ہو جاتا۔

السؤال:۔ آیات اور سورتوں کی ترتیب کو قلم بند کیجئے:

الجواب:۔ قرآن سورتوں اور آیات کا مجموعہ ہے۔ کچھ سورتیں قصار اور کچھ طویل ہیں۔ آیۃ سے مراد کتاب اللہ کا وہ جملہ ہے جو کسی سورت میں درج ہوتا ہے۔ سورۃ سے مراد آیات کا وہ مجموعہ ہے جس کی ایک ابتداء اور ایک انتہا ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔ یعنی وحی کے ذریعے آیات کی ترتیب کی گئی ہے۔ اس میں نبیؐ کے اجتہاد کا دخل نہیں ہے۔ کہ اسے توفیقی کہا جائے۔ جبریل امین آیات لا کر رہنمائی کرتے تھے۔ کہ اس آیت کو فلان آیت کے بعد لکھوایئے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس امر پر مسلمین کا اجماع نقل کیا ہے کہ ترتیب آیات توقیفی ہے۔ عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں رسول اللہؐ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہ آپؐ نے اپنی نظر اوپر اٹھائی پھر اسے نیچے جھکایا اور فرمایا: جبریل امین نے میرے پاس آکر مجھے حکم دیا ہے۔ کہ اس آیت کو سورۃ النحل کے مقام پر رکھو۔ ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ الخ آیۃ نمبر 90﴾ (اخرجہ احمد بسند صحیح) حضرت عثمانؓ نے ہر آیت کو قرآن میں اس کے صحیح مقام میں لکھ دیا ہے اگرچہ کوئی آیت منسوخ بھی ہو چکی ہو۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے: میں نے نبیؐ سے آیۃ الکلالۃ کے بارے میں بہت دفعہ سوال کیا تو آپؐ نے اپنی انگلی میرے سینے میں مار کر فرمایا: تجھے موسمِ گرما میں نازل ہونے والی سورۃ النساء کی آیۃ الکلالۃ کفایت کریگی۔ (رواہ مسلم) رسول اللہؐ کا کئی سورتوں کو ترتیبِ آیات کے ساتھ پڑھنا ثابت ہے۔ (نماز میں) یا خطبہ جمعہ میں۔ آپؐ جمعہ کی نمازِ فجر میں، الم تنزیل (السجدہ) اور سورۃ الدھر پڑھتے تھے۔ اسی طرح خطبہ میں سورۃ ق، سورۃ الجمعۃ، المنافقون نماز جمعہ میں پڑھتے تھے۔ زندگی کے آخری سال میں دو مرتبہ دور کیا اور یہ دور اسی ترتیب کے ساتھ تھا۔ جس ترتیب سے آج قرآن ہمارے پاس موجود ہے۔ ترتیبِ آیات کے بارے میں توقیفی ہونے سے متعلق احادیث حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے۔ کہ سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ اور بذریعہ وحی واقع ہوئی ہے۔ عہدِ نبیؐ میں اسی ترتیب سے قرآن مرتب تھا۔ جیسے آج ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور جن علماء کا خیال ہے کہ سورتوں کی ترتیب توفیقی (اجتہادی) ہے کوئی صحیح دلیل اس کی تائید نہیں کرتی سورتوں کے ترتیب کے توقیفی ہونے کی کسی صحابی نے مخالفت نہیں کی۔ لہذا پوری امت کا اس پر اجماع ہے۔

حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کی ترتیب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس اختلاف کی وجوہ بھی مختلف ہیں۔ ابن عباسؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا: آپؓ نے کس بناء پر سورۃ الانفال اور سورۃ البرآءۃ کو ملا دیا ہے اور ان کے درمیان، بسم اللہ الرحمان الرحیم نہیں لکھا؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ان دونوں سورتوں کا قصہ یکساں ہے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ دونوں سورتیں ایک ہی سورۃ کے زمرے میں آتی ہیں۔ میں نے ان دونوں کو ملا کر السبع الطوال میں رکھ دیا ہے۔ اسی دوران میں رسول اللہ فوت ہو گئے اور ہم پر واضح نہ کر سکے کہ سورۃ البرآءۃ سورۃ الانفال ہی کا حصہ ہے۔ خدیفہ ثقفی کہتے ہیں کہ ہم نے اصحاب رسولؐ سے پوچھا کہ کتنی کتنی سورتوں کا حزب (گروپ) بنایا جائے۔ جسے آدمی روزانہ اپنا وظیفہ بنالے۔ اصحاب رسولؐ نے کہا: کہ ہم تین، پانچ، سات، نو، گیارہ، اور تیرہ سورتوں کا حزب بنا کر وظیفہ کرتے ہیں۔

المفصل کا حزب (گروپ) سورہ، ق، سے ختم قرآن تک ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے۔ کہ حذیفہ ثقفی کی حدیث اس بات کی بین دلیل ہے۔ کہ عہد نبیؐ میں میں مختلف صحابہؓ کی ترتیب میں جو اختلاف ہے یہ توقیفی تربیت سے پہلے کا امر ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عہد نبیؐ میں قرآن کریم سوائے سورۃ الانفال اور براءۃ کے موجودہ ترتیب ہی کے ساتھ مرتب تھا۔

السؤال:۔ قرآن کی سورتوں اور آیات کی تقسیم اور خط عثمانی پر مختصر نوٹ لکھئے۔

الجواب:۔ الکرمانی نے، البرھان، میں کہا ہے، قرآن کریم کی موجودہ ترتیب ہی لوح محفوظ میں تھی۔ سورۃ البقرۃ کی آخری آیت نمبر 281 نازل ہوئی تو جبریل امین نے آیۃ الربا اور آیۃ الدین کے درمیان رکھنے کا حکم دیا۔ یہ دلیل بھی سورتوں کی ترتیب کے توقیفی ہونے کی تائید کرتی ہے۔

(سور القرآن اور آیات کی اقسام)

قرآنی سورتوں کی چار اقسام ہیں۔ (1) الطوال۔ (2) المئین (3) المثانی (4) المفصل۔ اب ہم قابل ترجیح رائے کا ذکر کرتے ہیں۔

(1) الطوال سات سورتیں ہیں۔ ۱۔ البقرہ۔ ۲۔ آل عمران ۔ ۳۔ النساء ۔ ۴۔ المائدۃ ۔ ۵۔ الانعام ۔ ۶۔ الاعراف ۔ ۷۔ الانفال اور

البرآءۃ اکھٹی مل کر ایک ہی سورۃ کی شکل میں۔
(2) المئون: وہ سورتیں جن کی آیات ایک سو سے زیادہ ہوتی ہیں۔
(3) المثانی: وہ سورتیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ مئون اور طوال سے زیادہ ان کا تکرار ہوتا ہے۔
(4) المفصل: یہ سورتیں سورۃ: ق: یا سورۂ حجرات سے شروع ہوتی ہیں۔ اور ان کی تین اقسام ہیں۔ طوالِ مفصل: اوساطِ مفصل: اور قصارِ مفصل۔ طوالِ مفصل: ق، حجرات: سے شروع ہو کر سورۂ: عم: یا: البروج: تک ہیں۔ اوساطِ مفصل: عم: یا: البروج: سے: والضحیٰ: یا: لم یکن: تک ہیں۔
اور قصارِ مفصل: الضحیٰ، یا لم یکن، سے آخر قرآن تک ہیں۔

سورتوں کی تعداد 114 ہے۔ (اگر سورۃ الانفال اور سورۃ البرآءۃ کو دو سورتیں قرار دیا جائے تو) اور اگر ان دونوں سورتوں کو ایک ہی سورۃ قرار دیا جائے تو تعداد 113 ہوگی۔

☆ آیات کی تعداد 6 ہزار 2 سو ہے۔ سب سے لمبی آیت آیۃ الدّین اور سب سے لمبی سورت سورۃ البقرۃ ہے۔

(عثمانی رسم الخط) اکثر علماء کی رائے ہے۔ کہ عثمانی رسم الخط بھی توقیفی ہے۔ اسکی مخالفت جائز نہیں ہے۔ اور اسی پر امت کا اجماع ہے۔ ایک صائب رائے یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کوئی رسم الخط فرض نہیں کیا۔ لہذا جو شخص جس طرح لکھنے میں آسانی سمجھے وہ لکھ سکتا ہے۔ جس شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ ایک مخصوص رسم الخط ہی کے ذریعے لکھنا واجب ہے۔ اس کے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ میرے نزدیک دوسری رائے قابلِ ترجیح ہے۔ کہ عثمان رسم الخط توقیفی نہیں ہے بلکہ اسے حضرت عثمانؓ نے پسند کیا ہے۔ بعض کلمات الف اور واؤ زائد ہوتے ہیں۔ لکھنے میں آتے ہیں مگر پڑھے نہیں جاتے۔ جیسے: اُولُوا: اس لفظ میں دو واؤ اور ایک الف زائد ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ عثمانی رسم الخط کی مخالفت حرام ہے۔ جیسے: اولوا: میں دو واؤ۔ اولیٰ: میں ایک واؤ اور ایک یاء وغیرھا۔ اس خط پر پوری امت کا اجماع ہے۔ اگر اس کی مخالفت کی جائے گی تو امت میں بہت بڑا انتشار و اختلاف پیدا ہوگا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے: شعب الایمان: میں کہا ہے: جو شخص قرآنِ کریم کی کتابت کرنا چاہے۔ اس پر حروف ھجائیہ کی پابندی لازم ہے۔ جن حروف کے ساتھ صحابہؓ نے قرآن کو مرتب کیا ہے۔ رسم الخط میں ان کی مخالفت نہ کرے۔ اس لئے کہ وہ ہم سے علم میں زیادہ، دل اور زبان کے زیادہ سچے اور امانت میں ہم سے زیادہ عظیم تھے۔ سو ہمارے لئے مناسب نہیں ہے کہ ہم کتابت

میں کمی بیشی کر کے ان کی اصلاح کریں۔ شروع میں عثمانی رسم الخط نقطوں اور حرکات سے خالی تھا اس لئے کہ اہل عرب اس کے محتاج نہیں تھے۔ جب غیر اہل عرب کا ان کے ساتھ اختلاف (میل جول) ہوا تو عربی زبان میں بگاڑ پیدا ہوا۔ علماء نے محسوس کیا کہ عثمانی رسم الخط میں اعراب اور نقطوں کے ساتھ خوبصورتی پیدا کی جائے۔ تب علماء نے عجمیوں کی سہولت کے لئے قرآنی حروف پر نقطے اور حرکات لگا دیں۔ پھر علماء نے آیات کے خاتمہ پر اوقاف و رموز کا اہتمام کیا؛ م: کو وقف لازم اور؛ لا: کو ممنوع؛ ج، کو آیت کے دونوں حصوں کو آپس میں ملانا یا نہ ملانا جائز قرار دیا وغیرھا۔ تاکہ ان اشارات سے قرآن فہمی میں آسانی پیدا ہو۔ ابن ابی دواود نے حسن بصری اور ابن سیرین سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حروف پر نقطے لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ربیعہ بن ابی عبد الرحمان نے کہا ہے: حروف پر حرکات لگانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ یہ امر مستحب ہے اس لئے اس طریقے سے غلط قرآءۃ اور تحریف سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ اب عثمانی رسم الخط کی خوبصورتی عربی خط میں انتہا کو پہنچ چکی ہے۔

السؤال:۔ (الفواصل ورؤس الآی) آیات کو ایک دوسری سے جدا کرنے کی علامات لکھیں۔

الجواب:۔ رأس الآیۃ سے آیت کی انتہا (خاتمہ) ہوتی ہے۔ اسے فاصلہ اس لئے کہا جاتا ہے اور اس سے آیت اپنے ماقبل اور مابعد سے جدا ہوتی ہے۔ اس طرح کے کلام کو لوگوں کے کلام سے سجع کہتے ہیں۔ (سجع کہتے ہیں ایسے کلام کو جس میں کئی کلمات ایک ہی وزن پر کہے گئے ہوں۔ اور ان کا آخری حرف (مقطع) بھی ایک جیسا ہو۔ جیسے سورۃ الطور کی آیات 1، 2، 3، اور 4 ہیں۔ ﴿والطور ، وکتاب مسطور ، فی رق منشور والبیت المعمور﴾ ان میں فواصل ہم وزن اوزان کے مقاطع یکساں ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ قرآن کریم مسجع کلام ہے۔ یہ خیال باطل ہے۔ اس لئے کہ مسجع کلام کرنا کاہنوں کا وطیرہ ہے۔ وہ لوگ ہم وزن کلام سے ایک ہی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ مگر قرآن کے ہموزن اور متماثل (ایک جیسے) کلمات سے مختلف اور جامع مفاہیم مراد ہوتے ہیں۔ اگر قرآن کریم بھی مسجع کلام ہوتا تو کفار کا یہ الزام صادق آتا کہ آپ کاھن ہیں۔ ویسے سورۃ الفجر کی پہلی چار آیات اور سورۃ التکویر کی آیات 15 تا 18 بھی ہم وزن اور متماثل ہیں۔ کچھ فواصل کے حروف آپس میں قریب ہوتے ہیں۔ جیسے۔ ﴿الرحمان الرحیم ، مالک یوم الدین﴾ ایاک نعبد

وایاک نستعین ۔میم اور نون آپس میں قریب ہوتے ہیں ۔اس لئے ان فواصل میں مقاطع متقارب الحروف ہیں۔

سورۃ ق: کی آیات 1 تا 3 متقارب المقاطع ہیں۔المجید اور عجیب میں دال با مقاطع ہیں۔مگر ایسے کلام کو مسجع نہیں کہا جاتا۔سجع میں ہر کلمہ کو مسجع نہیں کہا جاتا۔سجع میں ہر کلمہ کا مقطع (آخری حرف) یکساں ہوتا ہے۔

☆ کچھ فواصل متوازی ہوتے ہیں۔اور وہ کلموں کا ہموزن ہونا اور آخری حرف کا یکساں ہونا ہوتا ہے۔جیسے سورۃ الغاشیہ کی آیات نمبر 13 اور 14 ہیں ﴿نمارق مصفوفة وزرابی مبثوثة﴾ کبھی فواصل میں کوئی ایک حرف وزنِ سابق کی رعایت سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر 10 ہے: ﴿وتظنون باللہ الظنونا﴾ اس میں ایک الف زیادہ کیا گیا ہے۔اس لئے کہ اس سورۃ کے فواصل کے مقاطع میں تنوین کے بدلے الف زیادہ کئے گئے ہیں ان کی رعایت سے الظنون کے آخر میں الف زیادہ کیا گیا ہے۔

السوال:۔سات لہجوں پر نزولِ قرآن کے بارے میں مفصل نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔متواتر صحیح احادیث سے صراحتاً ثابت ہے کہ قرآن سات لہجوں پر نازل کیا گیا ہے۔مفسرین کی آراء میں اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جزیرہ العرب کے سات بڑے بڑے حصے ہیں۔اور ہر حصے کے لوگوں کی زبان میں ایک خاص مفہوم کے لئے الگ الگ الفاظ تھے۔اسی طرح جزیرۃ العرب کے بھی سات بڑے بڑے حصے تھے۔ابو حاتم سجستانی نے کہا ہے۔قرآنِ کریم۔قریش،ھذیل،تمیم،ازد،ربیعہ، ھوازن اور سعد بن بکر کی زبان میں نازل ہوا ہے۔شروع میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لہجے میں نزولِ قرآن کی خبر دی تھی۔پھر رسول اللہؐ کے مطالبے پر سات لہجوں پر قرآءۃِ قرآن کی اجازت دی گئی۔مگر جب قرآءۃ کے اختلافات سے انتشار و افتراقِ امت کا فتنہ پیدا ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہی لہجہ (قریش کی زبان) پر قرآن کو مرتب کر دیا۔باقی چھ لہجوں میں لکھے ہوئے مصاحف کو ختم کر دیا۔مفسرین نے سات لہجوں کی اس طرح تفصیل کی ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے۔مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کا ہر کلمہ سات لغات کا حامل ہے۔بلکہ سات قبائل کی لغات جدا جدا قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔بعض لغات قریش کی ہیں۔بعض ھذیل

کی، بعض ھوازن کی، اور بعض یمن کی ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ سات لہجوں سے مراد امر، نہی، وعدہ، وعید، جدل، قصص، اور امثلہ ہیں۔
یا امر، نہی، حلال، حرام، محکم، متشابہ، اور امثال ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ سات لہجوں پر نازل کیا گیا ہے۔ یہ حدیث مرفوع متصل ہے۔ (اخرجہ الحاکم والبیھقی) اختلاف لہجات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(1) تثنیہ، جمع، مذکر، مونث اسماء میں اختلاف کی مثال: سورۃ المومنون کی آیت نمبر 8 ﴿والذین هم لأماناتهم وعهدهم راعون﴾ اس میں امانات جمع کا صیغہ ہے۔ اسے مفرد صیغہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ مصحفِ عثمانی میں اس کی صورت الف کے بغیر منقسم ہے۔
(الاختلاف فی وجوہ الاعراب) جیسے سورۃ یوسف کی آیہ نمبر 31 ﴿ما هذا الا بشرا﴾ اس میں ما کا عمل، لیس کی طرح ہے۔ یہ اہلِ حجاز کی زبان ہے۔ ابن مسعودؓ نے بشر کو مرفوع پڑھا ہے۔ یہ بنی تمیم کی زبان ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ ما، لیس، کا فعل ناقص کی طرح بھی عمل کرتا ہے۔ (الاختلاف فی التعریف) جیسے سورہ سبأ کی آیت نمبر 19: ﴿
اس میں ؛ باعد ؛ فعل امر کا صیغہ ہے۔ اس میں ربنا میں ربّ کو منادی مضاف کے طور پر منصوب پڑھا گیا ہے۔ رفع کے ساتھ ربُّنا اور باعدَ صیغہ امر کی بجائے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پڑھا گیا ہے۔ اسی طرح الصراط کو السراط بھی پڑھا گیا ہے۔ (سورۃ الفاتحہ میں)

(4) (الاختلاف بالابدال) ایک حرف کے ابدال کی مثال: البقرۃ آیۃ 259 ﴿کیف نُنشِزُها﴾ اسے نَنشُرُها بھی پڑھا گیا ہے۔ پورے لفظ کے ابدال کی مثال۔ سورۃ القارعۃ کی آیت نمبر 5 ﴿کالعهن المنفوش﴾ ابن مسعودؓ نے کالعھن کی بجائے ؛ کالصّوف ؛ پڑھا ہے۔ کبھی ابدال مخارج میں بھی کیا جاتا ہے یعنی حا کی بجائے عین پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ حا اور عین کا مخرج ایک ہی ہے۔ جیسے سورۃ الواقعہ کی آیت نمبر 29 میں ﴿طلح منضود﴾ ہے اسے طلع منضود بھی پڑھا گیا ہے۔

(6) (الاختلاف بالزیادۃ والنقص) زیادتی کی مثال سورۃ التوبۃ کی آیۃ 100 ﴿واعد لهم جنات تجری تحتها الانهار﴾ اسے من تحتها الانهار من کی زیادتی کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ دونوں قرآتیں متواتر ہیں۔ سورۃ الکہف کی آیۃ۔ 79 ﴿قالوا اتخذ الله ولدا﴾ جمہور کی قراءت میں قالوا سے پہلے واؤ ہے مگر آیۃ نمبر 79 میں اسے کم کردیا گیا

ہے۔

(7) اختلاف اللہجات بالتفخیم والترقیق ۔ والفتح والامالۃ ، والاظھار والادغام ، والھمزۃ والتسھیل والاشمام وغیرھا۔امالہ کی مثال طٰہٰ کی آیۃ نمبر 9 ﴿ھل اتاک حدیث موسیٰ﴾ اس میں أتا کی بجائے أتٰی اور موسیٰ کی بجائے موسی بھی پڑھا گیا ہے۔ راء کو پُر نہ پڑھنے کی مثال۔ خبیراً بصیراً۔لام کو پُر کر کے پڑھنے کی مثال: (الطلاق) تسھیل الھمزۃ کی مثال ﴿قد افلح المؤمنون﴾ قد کی دال کو فا کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔اور ہمزہ کو جھٹکے کے ساتھ الگ نہیں پڑھا گیا۔اشمام الغین ضمہ مع الکسر کی مثال: ﴿وغیض الماء﴾ غین کی زیر کے ساتھ ضمہ جھلک دی جاتی ہے۔

(8) بعض علماء نے کہا ہے۔کہ سات کا عدد متعین نہیں ہے۔اس عدد میں اشارہ ہے۔کہ قرآن کی ترکیب میں حدود وابواب ہیں۔جیسے کلامِ عرب میں بہت سارے ابواب ہیں۔سات کے عدد سے کثرت مراد ہے۔جیسے سبعون (70) سے کثرت مراد ہے۔ایک جماعت نے کہا ہے۔کہ سات حروف سے مراد سات مختلف قرآتیں ہیں۔یعنی ایک مفہوم کو سات مختلف الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔جیسے پنجابی اور فارسی میں دل سرائیکی میں ہاں اور پشتو میں دل کو زڑ کہتے ہیں۔اس کی تائید بہت سی احادیث کرتی ہیں کہ قرآن کی سات قرآتیں ہیں۔ابو جہمؓ انصاری نے بیان کیا ہے: دو آدمیوں نے قرآن کی ایک آیۃ کے بارے میں جھگڑا کیا۔ ایک نے کہا: میں نے تو اس طرح نبیؐ سے سیکھا ہے۔دوسرے نے کہا: میں نے اس طرح نبیؐ سے سیکھا ہے۔پھر دونوں نے رسول اللہؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: قرآن سات حروف (لہجوں) پر نازل کیا گیا ہے۔قرآن میں جھگڑا نہ کیا کرو۔اس میں جھگڑا کرنا کفر ہے (رواہ احمد فی المسند)

فیصلہ کن امر یہ ہے کہ ایک معنیٰ کے لئے سات مختلف قبائل کی زبان میں سات مختلف الفاظ تھے۔جنہیں قرآءۃ میں استعمال کیا گیا ہے۔مصحف عثمانی کی جمع وترتیب کے بعد لازم نہیں ہے کہ ان کو اختیار کیا جائے۔عثمانی جمع وترتیب سے پہلے سات لہجوں ہی کی وجہ سے انتشار وافتراق برپا ہوا تھا۔

ایک اعتراض: جب امت کو سات لہجوں میں سے کسی ایک، لہجے میں قرآءۃ کا اختیار دیا گیا ہے تو باقی چھے لہجوں کو کیوں معدوم کر دیا گیا؟

امام ابن جریر طبری نے جواب دیا ہے۔ کہ ہم اب کتاب اللہ میں دوسرے چھ لہجوں کو موجود نہیں پاتے حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنھما کے دور میں قرآءت پر کوئی اور مختلف الفاظ کی وجہ سے تو ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے بھی دیئے جانے لگے۔ ان کا خاتمہ ضروری تھا۔ اگر مصحف عثمانؓ میں بھی وہ ساتوں لہجے برقرار رکھے جاتے تو اختلاف وانتشار اور افتراق امت کا خاتمہ ممکن نہ تھا۔

امام طبرانی رحمہ اللہ نے کہا ہے: سات حروف سے مراد سات زبانیں ہیں۔ اور جنت کے سات دروازوں کی نعمتوں کا ذکر ان میں ہے۔ اور وہ، امر، نہی، ترغیب، ترہیب، وعدہ وعید، قصص اور امثال ہیں۔ جس شخص نے ان پر عمل کیا ان میں غور وتدبر کیا۔ عبرت حاصل کی۔ وہ جنت کا حقدار ہو گیا۔ متقدمین میں سے کسی نے ہماری رائے کے خلاف کچھ نہیں کہا: جو ہم نے کہا ہے وہ شافی کافی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی صفت بیان کی ہے۔ جو سورہ یونس کی آیہ نمبر 57 میں ہے: ﴿یا ایھا الناس قد جآء تکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی ورحمۃ للمؤمنین﴾ ایماندار! اس کی نصیحتوں سے اپنی سینوں کی بیماریوں سے شفا پاتے ہیں۔ اور شیطان کے خطرناک وسوسوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔ لہذا قرآن انہیں اپنے علاوہ ہر طرح کے علاج ومداوا سے انہیں بے نیاز کرتا ہے۔ اور ہر میدان میں ان کی کفالت کرتا ہے۔ (انظر تفسیر طبری ج 1 ص 47، 67)

(حکمۃ نزول القرآن علیٰ سبعۃ احرف)

(1) ان پڑھ قوم کے لئے اس سے قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے کی آسانی حاصل ہوئی۔ ان میں ہر قبیلے کی زبان میں ایک ہی چیز کے مختلف نام تھے۔ اس حکمت کی تائید میں کئی احادیث وارد ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا ہے: جبریل امین نے رسول اللہؐ سے احجار المرآء کے مقام پر ملاقات کی اور فرمایا: مجھے ان پڑھ قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ جس میں غلام، خادم، بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں بھی ہیں۔ وہ قرآن کریم کو سات لہجوں میں پڑھیں۔ (تفسیر طبری ج 1 ص 47، 76)

2) قرآن کا فطری لغوی اعجاز۔

فطری طور پر اہل عرب کے سات بڑے بڑے علاقے تھے۔ اور سات بڑی بڑی قومیں تھیں، جن میں چیزوں کے اظہار میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس زبانی وسعت کے ساتھ ہی قرآن

نے انہیں چیلنج کیا ہے۔ جس کا جواب دینے سے تمام اہلِ عرب عاجز آ گئے تھے۔

(3) اعجاز القرآن فی معانیہ واحکامہ۔ بعض کلمات میں اور مفاہیم کی ادائیگی میں لفظی تبدیلی سے استنباط واجتہاد میں ساتوں قرآءت سے کام لیا۔

السؤال۔ قرآن اور قرآءت سے متعلق جامع نوٹ لکھیے:۔

الجواب۔ قراءۃ کے مذاہب تو بہت زیادہ تھے۔ مگر سات قرآءتوں پر کفائیت کی گئی ہے۔ اور ان قرآءتوں میں مشہور قرآء درج ذیل ہیں:۔ ابی بن کعبؓ، علیؓ، زید بن ثابتؓ، ابن مسعودؓ، قتادہؒ اور حسن بصریؒ، یہ سب اپنی اپنی قرآءۃ کی سند رسول اللہ تک مرفوع کرتے ہیں۔ باقی سب صحابہ اور تابعین نے انہی سے قرآءات سیکھی تھیں۔ مدینہ میں ابن المسیبؒ، عروہ بن مسعود، سالم، عمر بن عبدالعزیز، وغیرھم قرآن سکھاتے تھے۔ مکہ میں عبید بن عمیر، عطآء بن ابی رباح، طاوس، مجاہد، عکرمہ اور ابن ابی ملیکۃ معلم تھے۔ کوفہ میں علقمہ، الاسود، مسروق بصرہ میں ابو عالیہ، ابو رجآء، نصر بن عاصم اور یحیٰ بن یعمر وغیرہ تھے۔

شام میں المغیرۃ بن ابی شہاب المخزومی اور خلیفہ بن سعد معلم تھے۔ عہد تابعین میں پہلی صدی کے آخر میں درج ذیل سات امام مشہور ہوئے۔ جن کی قرآءات آج تک موجود ہیں۔ تاہم مصحف عثمانی کے بعد مختلف قرآءات کا تتبع اور جستجو لازم نہیں رہی۔ اگرچہ ائمہ کی مختلف قرآءات ابھی تک باقی ہیں۔ اور وہ پڑھی جاتی ہیں۔ ابو جعفر یزید ابن القعقاع المدنی، یعقوب بن اسحاق الحضرمی اور خلف بن ھشام یہ سب دس قرآءات شاذ ہیں۔ ان کی اسناد صحیح نہیں ہیں۔ ان سات قرآءات پر حصر کیا گیا ہے۔ جو مصحفِ عثمانی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ تاکہ امت انتشار وافتراق سے محفوظ رہے۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا۔ کہ ہر علاقے میں ایک امام قرآءۃ متعین کیا گیا۔

ابن جبر المکی نے اپنی کتاب میں پانچ ائمہ و قرآءات کا ذکر کیا ہے۔ اس نے ہر مصر اور علاقے سے ایک امام منتخب کیا ہے۔ اسلئے کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ علاقوں میں پانچ مصاحف بھیجے تھے۔ ابوبکر بن العربی نے کہا ہے: سات قرآءات کا عدد جواز کے لئے ہے۔ تاکہ ان سے زیادہ قرآءات پر توجہ نہ دی جائے۔

(انواع القرآءات وحکمھا وضوابطھا)

بعض علماء نے ذکر کیا ہے۔ قرآءت کی تین اقسام ہیں:۔ متواترہ، آحاد اور شاذہ پھر جو مزید

قرآءات سات مشہور متواترہ قرآءات کے علاوہ وارد ہیں وہ شاذ ہیں۔علماء کے نزدیک صحیح قرآءۃ کے ضوابط کے بارے میں جو قیاس ہے وہ درج ذیل ہے۔

☆ قراءۃ کا عربی زبان کے اصول وقواعد کے مطابق ہونا۔اور اس کا فصیح ہونا۔اس لئے کہ صحیح قرآءۃ ایسی سنت ہے جس کی پیروی لازم ہے۔اور وہ صحیح اسناد کے ساتھ ہو۔رائے کے ساتھ نہ ہو۔

☆ وہ قراءۃ مصحف عثمانی سے مطابقت رکھتی ہو۔مطابقت اور موافقت کی مثال:سورۃ الفاتحہ کی دوسری آیۃ ﴿مالک یوم الدین﴾ مصحف عثمانی میں مالک الف کے ساتھ ہے۔قیاس اور قواعد عربی کی رو سے مالک کو مَلِک کے لفظ سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے مصاحف عثمانی میں حذف الف کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

☆ یہ کہ قراءۃ صحیح اسناد کے ساتھ ہو۔اور وہ اس طرح کہ اس میں تینوں ارکان جمع ہوں۔1۔قواعد عربیہ کی مطابقت۔2۔خط عثمانی سے مطابقت۔3۔صحۃ السند۔ایسی قرآءۃ صحیح ہے۔اور جس قرآءۃ میں مذکورہ تین ارکان میں سے کوئی رکن بھی ناقص اور مختل ہو۔اسے ضعیف قرار دیا جائے گا۔کچھ نحویوں نے بعض قواعد نحویہ کی بناء پر بعض قراءتوں کا انکار کیا ہے حالانکہ نحوی قواعد قرآن پر حکم نہیں ہیں۔اسکی موافقت ہو خواہ وہ افصح ہو یا فصیح ہو۔تو وہ قرآءۃ صحیح قرار دی جائیگی۔قرآن کا اسلوب قواعد نحویہ کا محتاج نہیں ہے۔بلکہ قواعد نحویہ قرآنی اسلوب کے محتاج ہیں۔بعض علماء نے قرآءت کی چھ اقسام بیان کی ہیں۔

(1) التواتر (2) المشہور۔3۔الآحاد۔4۔الشاذ۔5۔الموضوع۔جس کی کوئی اصل نہ ہو۔6۔المدرج۔وہ زیادتی جو مفسر کی طرف سے وضاحت کے لئے درج کی گئی ہو۔جیسے ابن عباسؓ نے سورۃ البقرۃ کی آیۃ 198 میں ادراج کیا ہے۔

﴿لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم فی مواسم الحج فاذا قضیتم من عرفات﴾ اس آیۃ میں ابن عباسؓ نے تفسیری وضاحت کے لئے :فی مواسم الحج: کے الفاظ زیادہ کئے ہیں۔متواترہ اور مشہورہ کے علاوہ باقی چار قسم کی قرآءت کا پڑھنا جائز نہیں۔اس لئے کہ وہ مصحف عثمانی کے خلاف اور ضوابط قرآءات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ابن عبد البر نے مسلمین کا اجماع نقل کیا ہے۔کہ شاذہ قرآءۃ جائز نہیں ہے۔اور جو امام شاذہ قرآءۃ کرے۔اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔

السوال:۔قرآءت میں اختلاف کے فوائد لکھیے۔

الجواب:۔القرآءات الصحیحہ کے فوائد درج ذیل ہیں۔

(1) کتاب اللہ میں تبدیل وتحریف سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔اس طرح کہ ہر بڑے علاقے کے لوگوں کو ان کے مانوس ناموں کے استعمال میں دقت پیش نہیں آتی۔

(2) امت کیلئے قرآن فہمی کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔

(3) اختصارِ کلمات سے کلام اللہ کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے۔اور کتاب اللہ تکرار سے محفوظ رہتی ہے۔

(4) مجمل بیان کی دوسری صحیح قرآءۃ سے وضاحت ہو جاتی ہے۔جیسے سورۃ البقرۃ کی آیہ 222 ہے:﴿حتی یطھرن﴾ اسے: یطّھّرن بھی پڑھا گیا ہے۔مراد ہے کہ حائض کا خون ہونے ہی سے عورتوں کے ساتھ جماع نہیں کیا جاسکتا۔بلکہ وہ غسل کے ذریعے پاک صاف ہو جائیں تب ان سے وطی کی جا سکتی ہے۔سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 38 ہے:﴿والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما﴾ دوسری صحیح قرآءۃ: ایدیھما: کے لفظ سے وضاحت کردی گئی ہے۔کہ ہاتھوں ہی کو کاٹا جائے گا: ایدیھما: میں داہنے پاؤں کٹنے کا بھی احتمال تھا۔لہذا علماء نے کہا ہے۔کہ قرآءت کے اختلاف سے احکام کا اختلاف بھی ظاہر ہوتا ہے۔شاذہ قرآءۃ بھی مشہور قرآءۃ کی تفسیر و وضاحت کر دیتی ہے۔یہ امر تابعین کی طرف سے جب مستحسن قرار پاتا ہے تو صحابہؓ کی طرف سے تو بدرجہ اَولی مستحسن قرار پائے گا۔سات مشہور قرّاء درج ذیل ہیں۔

(1) ابو عمرو ابن العلاء جو بہت سے راویوں کے شیخ تھے۔وہ کوفہ میں 154 ہجری میں فوت ہوئے۔ان کے دو راوی الدوری اور سوسی ہیں۔

(2) عبداللہ بن کثیر المکی تابعی ہیں وہ مکہ میں 120 ہجر میں فوت ہوئے۔

(3) ابو رویم نافع بن عبدالرحمان بن ابی نعیم لیثی ہیں۔یہ مدینہ میں 169 ہجر میں فوت ہوئے ہیں۔

(4) عبداللہ بن عامر شامی جو ولید بن عبدالملک کی خلافت میں دمشق کے قاضی تھے۔یہ دمشق میں 118ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(5) عاصم بن ابی النجود کوفی ہیں۔یہ کوفہ میں 128ھ میں فوت ہوئے۔ان سے دو راوی ہیں۔شعبہ اور حفص۔شعبہ کوفہ میں 193ھ میں فوت ہوئے۔

حفص کوفہ میں 180ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(6) حمزہ کوفی۔ یہ خلافت ابی جعفر منصور میں حلوان کے مقام پر 156 میں فوت ہوئے ہیں۔

(7) الکسائی کوفی۔ وہ علی بن حمزہ کوفی نحویوں کے امام ہیں۔ یہ رے کی ایک بستی، برنبویۃ، میں فوت ہوئے ہیں۔

(8) ابو جعفر المدنی۔ یہ مدینہ میں 132ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(9) یعقوب البصری یہ ابو محمد یعقوب بن اسحاق بن زید الحضرمی ہیں۔ یہ بصرہ میں 205ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(10) ابو محمد خلف بن ھشام بن ثعلب البزاز البغدادی ہیں۔ یہ بغداد میں غالباً 229ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ اور اسحاق 286ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

بعض علماء نے ان دس قرآءتوں پر چار مزید قرآءتوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

(1) حسن بصری کی قرآءۃ۔ جو مشہور تابعی ہیں وہ مدینہ میں 110ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(2) محمد بن عبدالرحمان کی قرآءۃ جو 123ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(3) یحییٰ ابن المبارک الیزیدی النحوی۔ جو 220ھ میں فوت ہوئے ہیں۔

(4) ابو الفرج محمد بن احمد الشنبوذی کی قرآءۃ جو 388ھ میں فوت ہوئے۔

السؤال:۔ الوقف والابتداء پر مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔ وقف وابتداء کی قرآن فہمی میں شدید اہمیت ہے۔ اگر کوئی قاری وقف وابتداء کو نہ سمجھتا ہو تو وہ معانی کو بگاڑ بیٹھے گا۔ اس کی ایک مثال: سورۃ الکہف آیۃ 1۔ ﴿ولم یجعل له عوجا﴾ اس کے بعد آیہ:2 ہے۔ ﴿قیما لینذر باسا شدیدا من لدنه﴾ اگر قاری وقف وابتداء کو نہ سمجھتا ہو تو احتمال ہے کہ وہ: قیما: کو عوجا کی صفت سمجھ لے۔ حالانکہ ٹیڑھی چیز کسی چیز کو درست اور سیدھا نہیں کر سکتی۔ اگر قاری وقف وابتداء کو سمجھتا ہو گا تو دوسری آیت کو سمجھنے میں اُسے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ وقف وابتداء کی اہمیت جاننے کے لئے ابن عمرؓ کی حدیث بہت واضح ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہم نے ایک زمانہ زندگی بسر کی ہے۔ ہم میں سے کوئی تو ایسا تھا کہ قرآن سے پہلے ہی وہ مومن تھا۔ اب ہم ایسے آدمیوں کو دیکھتے ہیں جن کے پاس قرآن ان کے ایمان لانے سے پہلے آیا۔ سو وہ سورۃ فاتحہ سے لے والناس تک قرآن کو پڑھتا ہے۔ مگر اس کے امر و نہی کو نہیں جانتا۔ اور نہ وقف وابتداء کو جانتا ہے۔ حالانکہ

قرآن کا ہر حرف پکارتا ہے: میں تیری طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں۔ تاکہ تو مجھ پر عمل کرے۔اور مجھ سے تو نصیحت حاصل کرے۔(البرھان، للزرکشی ج 1 ص 342)

علماء نے وقف کی آٹھ قسمیں بیان کی ہیں۔مشہور چار اقسام ہیں۔

(1) تام مختار (2) کاف جائز (3) حسن مفہوم (4) قبیح متروک:

(1) وقف تام وہ جس سے پہلے کے کلمات کا بعد والے کلمات سے کوئی تعلق نہ ہو۔

مثال:۔﴿اولئک ھم المفلحون﴾ آیہ نمبر 6 ﴿ان الذین کفروا﴾ آیہ نمبر 5 سے آیہ نمبر 6 کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(2) الکافی الجائز۔جس آیۃ کے آخر میں لام ہو۔مثال سورۃ یٰسین کی آیات 69،70 ﴿ان ھو الاذکر وقرآن مبین . لینذر من حیا ویحق القول علی الکفرین ﴾ یقیناً وہ تو نصیحت اور واضح قرآن ہے۔تاکہ زندہ لوگوں کو ڈرائے اور کفار پر اللہ کا قول ثابت ہو جائے۔(ان پر اتمام حجت ہو جائے) ان دونوں آیات کو ملانا اور نہ ملانا جائز ہے۔

(3) الحسن: یہاں ٹھہرنا بہتر ہے۔اسکے بعد فوراً ابتداء نہیں کرنی چاہیے۔مثال سورۃ فاتحہ کی پہلی دو آیات۔

(4) یہ ایسا وقف ہے جس کی مراد کو سمجھنا مشکل ہو۔اور اس پر وقف کرنا بڑا ہو۔مثال: المآئدۃ کی آیۃ: 73: ﴿لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ﴾ اس میں قالوا پر وقف کرنا بُرا ہے۔

السؤال:۔(تجوید اور آداب تلاوت پر مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔تجوید کا لغوی معنیٰ ہے۔کسی چیز میں عمدگی پیدا کرنا۔تجوید القرآن کا اصطلاحی معنی ہے۔قرآن کریم کے الفاظ کو عمدہ طریق سے خوش آوازی کے ساتھ پڑھنا۔اس طرح پڑھنے سے قاری اور سننے والے کے دل پر گہرا اثر ثبت ہوتا ہے۔اور قرآن فہمی میں مدد ملتی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو خوش آوازی عطا کی گئی تھی۔رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا: جو شخص چاہتا ہے کہ قرآن کو اسی کیفیت سے پڑھے جیسے وہ نازل ہوا ہے۔تو قرآن کو عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح پڑھے۔حروف ندا کو ان کے صحیح مخارج سے ادا کرنا ایک علمی صنعت ہے۔علماء نے اس پر بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں۔تجوید کے قواعد پڑھ لینے سے ہی آدمی ماہر نہیں بنتا۔بلکہ اس کی مشق سے مہارت حاصل ہوتی ہے۔

تجوید کے لئے اوقاف و رموز کا جاننا بھی ضروری ہے۔اور وہ ہیں:۔الوقف، الامالۃ، الادغام، ھمزہ کو جھٹکے سے پڑھنا۔را کو باریک پڑھنا اور پُر کر کے پڑھنا اور حروف کو ان کے مخارج

سے ادا کرنا۔ تجوید کے بغیر پڑھنے کو علماء نے لحن قرار دیا ہے۔
لحن کی دو قسمیں ہیں۔ لحنِ جلی اور لحنِ خفی۔ لحن جلی یہ ہے۔ کہ آدمی اعراب میں خطا کرے۔ زیر کی بجائے زبر اور مد کو قصر، قصر کو مد کردے۔
لحن خفی یہ ہے آدمی حروف کو صحیح مخارج سے ادا نہ کرے۔ قاف کو کاف کے مخرج سے ادا کرے۔ اور ضاد کو ذا کے مخرج سے ادا کرے۔ الغرض لحن خفی اصوات الحروف میں خطا اور خلل کا نام ہے۔ قرآن کو موسیقی کی طرز پر پڑھنا لحن سے کم نہیں ہے۔ جیسے آج کل حُسنِ قرآء ت کے مقابلوں میں قاری کانوں پر ہاتھ رکھ کر قوالوں کی طرح گرگری (uibration) کرتے ہیں۔ اور فلمی گانوں کی طرز پر پڑھتے ہیں۔ یہ تکلیف بھی معیوب ہے۔ یہ ترعید ہے۔ ایسا لرزہ طاری کرنا جیسے کوئی سردی یا کسی دُکھ سے کانپ رہا ہو۔
علماء نے ترتیل کے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ (1) ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ (2) حدر۔ مخارج کی صحیح ادائیگی کے ساتھ تیز پڑھنا اس طرح کہ ہر حرف کا حق ادا ہو جائے۔
(3) ترتیل اور حدر کی درمیانی کیفیت سے پڑھنا۔ جسے تدویر کہا جاتا ہے۔ قرآن کی کثرت سے تلاوت کرنا اسلام کی عظیم اور مستحب سنت ہے۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: دو آدمیوں پر حسد و رشک کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال عطا کیا ہو اور وہ اُسے (اللہ کی راہ) میں دن رات خرچ کرتا ہو۔ دوسرا وہ آدمی جو دن رات قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہو۔ (بخاری و مسلم)۔
اخلاصِ نیت سے تلاوتِ قرآن پر اجر ملتا ہے۔ فرمانِ رسولؐ ہے: جو شخص قرآن کا ایک حرف پڑھے اسے ایک نیکی ملتی ہے۔ اور ایک نیکی پر دس نیکیاں دیجاتی ہیں۔ (رواہ الترمذی) اسلاف میں سے کوئی قرآن کو ایک دن رات میں ختم کر لیتا تھا۔ اور کوئی زیادہ دنوں میں۔
عبداللہ بن عمروؓ کو رسول اللہؐ نے فرمایا: (جب انہوں نے کہا) کہ میں زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ (یعنی بہت تھوڑے وقت میں قرآن کو ختم کرسکتا ہوں) سات دنوں میں قرآن کو ختم کر اور اس پر زیادتی نہ کر۔ (یعنی سات دنوں سے کم میں قرآن کو ختم نہ کر) رسول اللہؐ نے قرآن یاد کرنے کے بعد بھلا دینے پر بہت ڈرایا ہے: فرمایا: قرآن کو دہراتے رہو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ وہ اس اونٹ سے بھی تیزی کے ساتھ ذہن سے نکل جاتا ہے۔ جو گھٹنے سے رسی کھل جانے سے بھاگ جاتا ہے۔ جو شخص غور و فکر تیزی سے کر لیتا

ہے۔ وہ سات دنوں سے کم وقت میں بھی قرآن کو ختم کر سکتا ہے۔

آداب التلاوۃ:

قاری قرآن کے لئے درج ذیل امور مستحب ہیں۔

(1) یہ کہ باوضو ہو۔ (2) تلاوت کا مقام صاف ستھرا ہو۔ (3) یہ کہ سکون ووقار اور اطمینان قلب کے ساتھ تلاوت کرے۔ ذہنی خلفشار میں مبتلا نہ ہو۔

(4) تلاوت سے پہلے مسواک کرے۔ (5) تلاوت قرآن سے پہلے شیطان کے شر سے پناہ مانگنے۔ پڑھے (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) بعض علماء نے استعاذہ کو واجب قرار دیا ہے۔ (6) سوائے سورۃ براءۃ کے ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے اس لئے کہ بسملہ بھی سورت کی ایک آیت ہوتی ہے۔ (7) تلاوت ترتیل کے ساتھ کرے۔ یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور تمام حروف کو ان کے صحیح مخارج سے ادا کرے۔ اور مد کرے یعنی حروف مدہ کو دراز کرے۔ شعروں کی طرح تیز تیز نہ پڑھے جیسے قوال شعروں کو پڑھتے ہیں۔ (8) یہ کہ تلاوت قرآن میں غور وتدبر بھی کرے۔ کہ اہم مقصود قرآن کے الفاظ پر غمزدہ ہو۔ (10) خوش آوازی سے تلاوت کرے۔ اس لئے کہ خوش آوازی نفس پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ (11) بلند آواز سے تلاوت کرے۔ کہ جہر میں کئی اعضاء شریک ہوتے ہیں۔ (12) مصحف کو دیکھ کر تلاوت کرنا افضل ہے۔ اس لئے کہ اس عبادت میں آنکھیں بھی شریک ہوتی ہیں۔ ایک رائے ہے کہ زبانی تلاوت بہتر ہے۔ صحیح رائے پہلی ہے۔ جو شخص حافظ قرآن ہو وہ بغیر مصحف کے تلاوت کر سکتا ہے۔ کہ اس طرح وہ تدبر میں آسانی پاتا ہے۔

(تعلیم القرآن ولا لأجرۃ علیہ) بغیر اجرت کے کتاب اللہ پڑھانا انبیاء علیہم السلام کا عمل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قاری تعلیم القرآن پر کچھ لینے کی شرط نہ کرے۔ البتہ اگر بغیر شرط کے کوئی ہدیہ ملے تو قبول کر لے۔ پوری امت کے معلمین اجرت لیتے ہیں۔ نبی بھی ہدیہ قبول کر لیتے تھے۔

ایک کافر پر سورۃ الفاتحہ کا دم کرنے سے اجرت طے کرنے سے اجرت میں تیس بکریوں کا ریوڑ ملا تھا۔ نبیؐ نے برا نہیں منایا بلکہ فرمایا تھا۔ میرا بھی ان میں حصہ رکھو۔ اس حدیث سے اجرت لینے کا جواز ملتا ہے۔

السؤال:۔ وہ کونسے قواعد ہیں جن کا مفسر محتاج ہوتا ہے؟

الجواب: ارشادِ باری سورۂ یوسف کی آیۃ نمبر 2 میں ہے: ﴿انا انزلناہ قرآنا عربیاً لعلکم تعقلون﴾ بیشک ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے۔ تاکہ تم (اسے) سمجھو؛ چونکہ قرآنِ کریم کو عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ اس لیے مفسرِ قرآن کے لئے عربی زبان کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔

اور وہ اہم عربی قواعد درج ذیل ہیں۔ ضمائر۔ ضمائر کے استعمال سے قرآنِ کریم تکرارِ الفاظ سے محفوظ ہو گیا ہے۔ اگر ضمائر کی بجائے تکرارِ الفاظ کا وجود ہوتا تو قرآنِ کریم کی ضخامت میں کئی ہزار گنا اضافہ ہو جاتا۔ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر 35 کی ایک ہی مثال کافی ہے۔ ﴿ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین الصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والصائمون وا الصائمات والحافظین فروجھم والحافظات والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعدلھم مغفرۃ واجر ا عظیما﴾ اس آیت میں ایماندار مردوں اور عورتوں کی خبر دی گئی ہے۔ ان کے لئے، کا ضمیرِ جمع مذکر غائب ؛ لھم ؛ استعمال کیا گیا ہے۔ اس ضمیر کی وجہ سے سابق بیس صفات کا تکرار نہیں کیا گیا۔ اسی طرح قرآن میں بے شمار مقامات میں اسماء ظاہرہ کے تکرار کی بجائے مناسب ضمائر کا استعمال کیا گیا ہے۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ ضمیر سے پہلے مرجع اسم ظاہر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے سورہ ھود کی آیۃ 42 ہے: ﴿ونادیٰ نوح ابنہ﴾ ابنہ میں ؛ہ؛ ضمیر واحد مذکر غائب ہے: اس کا مرجع مقدم ؛نوح؛ ہے۔ یا مرجع کو ضمناً سمجھا جائے گا۔ جیسے سورۃ المآئدۃ کی آیۃ :8 ہے: ﴿ولا یجرمنکم شنآن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ﴾ اس میں ،ھو، ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ اور اس کا مرجع ،اعدلوا، کے ضمن میں ،العدل، کو قرار دیا گیا ہے۔ کبھی مرجع لفظاً متأخر ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ طٰہٰ کی آیت 67: ﴿فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ﴾ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف کو چھپایا: اس میں مرجع موسیٰ لفظاً متأخر ہے مگر رتبۃً مقدم ہے۔ کبھی ضمیر کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے۔ اور اس کی خبر بعد میں دی جاتی ہے۔ کبھی ضمیر کے لفظ کا پہلے لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پھر معنیٰ کا خیال رکھا جاتا ہے: جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ :8 ہے ﴿ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وماھم بمؤمنین﴾ آمنا؛ جمع متکلم کے

صیغے میں لفظ؛ الناس؛ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔لفظ؛ من؛ کی وجہ سے یقول میں؛ ضمیر واحد غائب؛ کا ذکر ہے۔ پھر؛ من؛ کے معنوی اعتبار سے؛ وما ہم؛ میں ہم ضمیر جمع مذکر غائب کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲)دوسرا قاعدہ: تعریف والتنکیر ہے:

تنکیر کے چند ایک مقامات ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی ایک چیز کا ذکر مراد ہو۔ جیسے سورۃ القصص کی آیۃ:29 ہے: ﴿وجآء رجل من اقصی المدینۃ یسعیٰ﴾ اور شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ یا کسی نکرہ کی عظمت مراد ہوتی ہے: جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ:279 ہے: ﴿فاذنوا بحربٍ من اللہ﴾ اس حرب نکرہ کی تعظیم مراد ہے۔ یا نکرہ تحقیر کے لئے بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ عبس کی آیۃ نمبر 18 ﴿من الی شیء خلقہ﴾ اس میں شیء نکرہ کی تحقیر بیان کی گئی ہے۔ یا تعلیل کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ براءۃ کی آیت:72 میں رضوان من اللہ اکبر: سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تھوڑی رضا مندی بھی جنتوں سے بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔

تعریف کے بھی کئی مختلف مقامات ہیں۔ متکلم، حاضر، یا غائب کے ضمائر سے سامع کے ذہن میں کسی خاص چیز کو حاضر کیا جاتا ہے۔ یا کسی خاص نام سے سامع کو روشناس کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ الفتح کی آیت:29 ہے۔ ﴿محمد رسول اللہ﴾ اس میں رسول اللہ کے معرفہ سے محمد ﷺ کی صفت بیان کی گئی ہے۔ یا تعریف سے کسی چیز کی توہین مراد ہوتی ہے۔ جیسے ﴿تبت یدا ابی لھب وتب :المسد۔ا﴾ اس میں ابولہب کے مرکب معرفہ سے اس کی توہین مراد ہے۔ یا اسم موصول سے عموم مراد ہوتا ہے۔ جیسے ﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا العنکبوت:69﴾ اس میں رہنمائی کا وعدہ عام ہے۔ یا معہود ذہنی مراد ہوتا ہے ﴿جیسے لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ الفتح: 18﴾ اس میں المؤمنین ؛ الف لام تعریف ان صحابہ کو ذہن میں حاضر کرتا ہے جنہوں نے 14 سو کی تعداد میں آپ کی بیعت کی تھی۔ یا الف لام تعریف استغراق کے لئے ہوتا ہے۔ یعنی معرف باللام کے تمام افراد جنس مراد ہوتے ہیں۔ جیسے ﴿ ان الانسان لفی خسر﴾ (العصر 2) الانسان پر الف لام تعریف سے نوع انسان کے تمام افراد مراد ہیں۔ اگر معرفہ اسموں کا دو دفعہ ذکر ہو تو دوسرا معرفہ مراد ہوتا ہے۔ جیسے ﴿ان الانسان لفی خسر﴾

(العصر 2) الانسان پر الف لام تعریف سے نوع انسان کے تمام افراد مراد ہیں۔ اگر معرفہ اسموں کا دو دفعہ ذکر ہو تو دوسرا معرفہ مراد ہوتا ہے۔ جیسے ﴿اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم الفاتحہ 6،7﴾ اس میں معرفہ اسموں کا دو دفعہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور مراد دوسری دفعہ ذکر کردہ اسم معرفہ ہے۔ کبھی دونوں معرفہ اسم جمع ہو جاتے ہیں ۔جیسے ﴿ان مع العسر یسرا۔ ان مع العسر یسرا﴾ (الانشراح: 5،6) ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ عسر دو آسانیوں پر غالب نہیں آ سکتا۔ اگر دو اسموں میں پہلا نکرہ ہو اور دوسرا معرفہ تو نکرہ سے بھی دوسرا معرفہ ہی مراد ہوگا۔ جیسے ﴿کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً فعصیٰ فرعون الرسول﴾ (المزمل 5،6) پہلا رسول نکرہ ہے اور دوسرا معرفہ ہے مراد معرفہ ہی ہے۔

(3) تیسرا قاعدہ: الافراد والجمع:

کبھی جمع کے صیغے سے مفرد اور مفرد کے صیغہ سے جمع مراد ہوتی ہے۔ بعض الفاظ قرآن میں جمع ہی کے صیغے سے وارد ہیں۔ مگر دلیل کے طور پر ان کا مفرد مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ الزمر کی آیۃ: 21 ہے۔ ﴿ان فی ذلک لذکریٰ لأولی الالباب﴾ بیشک اس میں عقل مندوں کے لئے یقیناً عبرت ہے۔ الالباب کا مفرد: اللب: قرآن میں وارد نہیں ہے۔ مگر اس سے ہر مفرد عقل مند مراد ہے۔ اسی طرح: اکواب موضوعۃ: کا مرکب توصیفی ہے۔ اکواب کا مفرد قرآن میں وارد نہیں ہے۔ بعض الفاظ مفرد ہی وارد ہیں۔ حسب ضرورت ان کی جمع بھی ذکر کی جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وسعت مراد ہوتی ہے۔ تو جمع ذکر ہوتا ہے۔ جیسے ﴿سبح للہ ما فی السموٰت وما فی الارض ۔الحشر آیۃ: 1﴾۔ اور جب جہۃ اور سمت مراد ہوتی ہے تو مفرد صیغہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ الملک کی آیۃ 16 ہے: ﴿أامنتم من فی السمآء ان یخسف بکم الارض﴾ کیا تم اس ذات سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے (کیا تم اپنے اس انجام سے بے خوف ہو؟) اسی طرح کا معاملہ ہے۔ جب اللہ کی رحمت سے اس کا تعلق ہوتا ہے تو جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے۔ اس لئے رحمت کی صورتیں کئی ہوتی ہیں۔ جب اس کا تعلق عذاب سے ہوتا ہے تو اس کا صیغہ مفرد لایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے باغی قوم کی تباہی ہی مراد ہوتی ہے۔ اور اس میں کسی طرح کی تقسیم نہیں ہوتی۔

(مقابلة الجمع بالجمع أو بالمفرد)

کبھی جمع کے صیغہ سے مراد ہر فردِ جمع ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ نوح کی آیۃ: 7 میں ارشادِ ربانی ہے۔﴿وانی کلما دعوتھم لتغفرلھم جعلوا اصابعھم فی آذانھم واستغشوا ثیابھم ﴾ اور جب بھی میں نے انہیں دعوت دی تا کہ تُو انہیں بخش دے انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں داخل کرلیں۔ اور اپنے کپڑوں سے اپنے چہروں کو ڈھانپ لیا۔ اس میں پانچ دفعہ؛ ھم؛ ضمیر جمع غائب کا صیغہ مذکور ہے۔ مگر اسے مراد ان کی جمعیت کا ہر فرد ہے۔

☆ کبھی جمع کے صیغے سے جمیعت کے کل افراد مراد ہوتے ہیں۔ جیسے سورۂ نور کی آیت: 4 میں ارشادِ ربانی ہے ﴿والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتوا باربعة شھدآء فاجلدوھم ثمانین جلدة ﴾ اور وہ لوگ جو پاکدامن عورتوں پر (بدکاری کا) الزام لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے ان سب کی اسّی اسّی کوڑے مارو۔ اس جمع کے صیغے سے کوئی فرد بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ سورۂ نوح کے صیغہ ہائے جمع سے ایماندار لوگ مستثنیٰ ہیں۔

(5) (کسی لفظ کو دوسرے لفظ کا ہم معنیٰ خیال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ مترادف نہیں ہوتا)

جیسے (الخوف والخشیۃ) خشیۃ کو خوف کا مترادف گمان کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خشیۃ میں خوف کی زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ جیسے شجرۃ خشیۃ سے مراد وہ درخت ہے جو بالکل خشک ہو کر ختم ہو چکا ہو۔ اور ناقۃ خوفآء سے مراد وہ اونٹنی ہے جو بالکل مرنہ چکی ہو بلکہ اس میں کسی بیماری کی وجہ سے کوئی نقص ہو۔ لہذا خوف سے مراد ضعف اور خشیۃ سے مراد طاقتور ہونے کے باوجود شدید خوف کالاحق ہونا ہے۔ اسی لئے خشیۃ کی نسبت زیادہ تر اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔

اسی طرح (الشح والبخل) کو مترادف المعنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ الشح البخل سے زیادہ معنیٰ پر مشتمل ہے۔ یعنی الشح کثرت مال کی حرص کے ساتھ بخل کا معنیٰ دیتا ہے اور یہ ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

(6) (السؤال والجواب)

جواب کے بارے میں اصل تو یہ ہے کہ سوال ہی کا جواب دیا جائے مگر کبھی سوال کے اصل جواب سے کچھ زیادہ جواب بھی دے دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال سورۃ البقرۃ کی آیۃ نمبر 189 میں ارشادِ ربانی ہے ﴿ یسألونک عن الاھلة قل ھی مواقیت للناس

والحج ﴾ اصحاب رسولؐ نے چاند کے بارے میں سوال کیا تھا۔ کہ شروع میں یہ دھاگے کی طرح باریک ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ بھرک پُر ہوا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبیؐ سے اسی سوال کا جواب نہیں دلایا بلکہ اضافی طور پر حج کے موسم کا بھی ذکر کرا دیا ہے۔ پھر چاند مسلسل طور پر گھٹتا گھٹتا پہلی حالت میں اس طرح کرنا چاہیے تھا۔ کبھی جواب سوال سے عام صورت میں دیا جاتا ہے۔ اور کبھی تقاضاء سوال سے جواب کم دیا جاتا ہے۔ جیسے کفار نے سوال کیا کہ اس قرآن کے علاوہ اور قرآن لائیے یا اس میں (ہماری خواہش کے مطابق) کچھ تبدیلی کر دیجئے۔ تبدیلی کرنا نئی اختراع سے آسان تھا۔ مگر اللہ نے نبی کی زبانی اختراع ہی کی نفی کرا دی تبدیلی کا جواب نہیں دلایا۔

(7) (الخطاب بالاسم والخطاب بالفعل)

اسم ثبوت اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ اور فعل تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی فعل میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ اسم اور فعل ایک دوسرے کے قائم مقام نہیں ہوسکتے۔

جیسے فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آکر ؛سلاما؛ کہا۔ اس کا مصدر تسلیم قرار دیا گیا ہے۔ تقدیر یوں ہے: نسلم علیک سلاماً۔ ؛سلاما؛ مفعول مطلق کے طور پر منصوب ہے۔ جواب میں ابراہیم علیہ السلام کے ؛سلامٌ؛ کہا۔ اس جملے میں ؛سلامٌ؛ مبتداء ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ اور مبتداء مفعول مطلق سے عظیم الشان ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمانِ الٰہی کے مطابق فرشتوں کے سلام کے جواب میں ان احسن کلمہ کہا: فرمانِ باری ہے۔ ﴿ اذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا او ردوھا ﴾ جب تمہیں کوئی سلام کہا جائے تو (جواب میں) اس سے بہتر کلمہ کہو یا اسی کو لوٹا دو۔ (سورۃ النساء آیۃ: 86) چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فرمانِ الٰہی کے مطابق فرشتوں کے سلام سے بہتر سلام جواب دیا۔

(8) (العطف) لفظ پر عطف اصل ہے۔ اس کی مثال:

سورۃ المائدۃ کی آیت نمبر 69 ہے: ﴿ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئون﴾ ھادوا والصابئون کا عطف ان کا اسم ہے یعنی ایماندار لوگ اس کا محل رفع ہے ابتداء کی بناء پر

عطف علی المعنی کی مثال: سورۃ المنافقون کی آیۃ نمبر 10 ہے: ﴿لولا اخرتنی الی اجل

قریب فاصدق واکن ﴾ خلیل اور سیبویہ نے اس عطف پاقا کو آرزو کے معنی اور مفہوم پر قرار دیا ہے۔ علماء نے ضمیر مجرور پر ضمیر جار کے اعادہ کے بغیر عطف کو جائز قرار دیا ہے۔ اس کی مثال سورۃ النساء کی آیۃ 1 ہے۔ ﴿ واتقوا اللہ الذی تسآئلون بہ والارحام ﴾ ان کے نزدیک الارحام کو مجرور پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 217: ﴿ وصد عن سبیل اللہ وکفر بہ والمسجد الحرام ﴾ میں المسجد کو مجرور ضمیر پر عطف قرار دیا ہے۔

(ایتآء اور اعطآء میں فرق)

الایتآء کا درجہ الاعطآء سے زیادہ بلند ہے۔ اس کی مثال سورۃ البقرۃ کی آیہ نمبر 269 ہے: ﴿ یؤتی الحکمۃ من یشآء ومن یؤت الحکمۃ فقد أوتی خیرا کثیرا ﴾ حکمت جس میں جاگزیں ہو جائے تو وہیں وہ ایک ہی کیفیت میں واقع ہو جاتی ہے۔ اور اعطآء کے درجات میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ﴿ انا اعطینٰک الکوثر ﴾ الکوثر کا مفہوم خیر کثیر ہے یعنی اس کی منازل ایک سے ایک بلند تر مقام رکھتی ہیں۔

(لفظ فعل)

لفظ فعل کی افعال سے کنایہ ہے ایک ہی فعل پر دلالت نہیں کرتا۔ اس سے اختصار کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ المآئدۃ کی آیہ نمبر 79 میں ارشاد ربانی ہے۔ ﴿ لبئس ما کانوا یفعلون ﴾ اس کا مفہوم ہر برائی کو شامل ہے۔ جس سے کافر اجتناب نہیں کرتے تھے۔ جب کلام الٰہی میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو تو اسے شدید دھمکی پر محمول کیا جاتا ہے۔ جیسے ﴿ الم تر کیف فعل ربک باصحب الفیل ۔ الفیل: 1 ﴾ اس میں کفار مکہ کو شدید دھمکی دی گئی ہے۔ کہ تم آخری نبی کو ختم کرنے کی جو تدبیریں کرتے ہو۔ تو تم جانتے ہو کہ اللہ نے ہاتھی والوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہی سلوک تم سے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس دھمکی کا مظاہرہ اس نے غزوہ بدر میں کر دیا جس میں کفار کے ستر (ہاتھی) بڑے بڑے سردار ذلت کی موت کا شکار ہوئے اور ستر سردار گرفتار ہوئے۔

(لفظ کان)

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں لفظ کان بہت دفعہ استعمال ہوا ہے۔ نحویوں کے اس میں مختلف مذاہب ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ: کان: انقطاع کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی کان فعل کی مختلف کیفیات کی خبر دیتا ہے۔ وہ ﴿کان اللہ خبیرا بصیرا﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ (اس امر سے) خبردار اور دیکھنے والا تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو تو اس کے مفہوم میں دوام واستمرار پایا جاتا ہے۔ وہ ﴿کان اللہ غفورا رحیما﴾ کا ترجمہ کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ بخشنے والا اور مہربان ہے؛

(لفظ: کاد)

کاد کے بارے میں بھی علماء کے مختلف مذاہب ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ تمام افعال کی طرح یہ بھی اثبات ونفی کا مفہوم دیتا ہے۔ اور یہ اپنے ساتھ مربوط فعل کے مقاربہ پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے ﴿لایکادون یفقھون حدیثا﴾ یعنی وہ بات سمجھنے کے قریب نہیں آتے: (وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے) ﴿وان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصارھم﴾ اور یقینا قریب ہیں کہ کافر آپ کو اپنی بد نگاہی سے ڈگمگا دیں۔ اس میں مقاربہ فعل کا اثبات ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی نفی اثبات اور اس کا اثبات نفی ہوتا ہے۔ اثبات کی مثال سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 71 ہے: ﴿وما کادوا یفعلون﴾ وہ گائے کو ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ نفی ہے مگر آخر کار انہوں نے گائے کو ذبح کر ہی دیا۔ یہ نفی سے اثبات کی مثال ہے۔

(لفظ: جعل)

لفظ: جعل، قرآن کریم میں کئی معانی دیتا ہے۔ ایک معنیٰ سمّٰی، ہے۔ مثال۔ سورۃ النجم کی آیۃ 27 ہے: ﴿ان الذین لا یؤمنون بالآخرۃ لیسمّون الملآئکۃ تسمیۃ الانثیٰ﴾ ﴿وجعلوا الملآئکۃ الذین ھم عباد الرحمن اناثا﴾ انہوں نے فرشتوں کو جو رحمان کے بندے ہیں ان کو عورتوں کا نام دیتے ہیں۔ (کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ خود تو بیٹی کی پیدائش پر اپنی ذلت سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بیٹیاں منسوب کرتے ہیں۔ یہ کفر وشرک ہی کی وجہ سے دماغی خلل کا کرشمہ ہے) دوسری رائے میں جعل اوجد کے معنی میں ہے۔ خلق اور ایجاد کے معانی میں یہ فرق ہے کہ خلق کسی چیز کے عدم سے وجود میں لانے کا مفہوم دیتا ہے۔ اور ایجاد کسی چیز کے وجود میں آنے کے بعد اس میں کسی چیز کے پیدا کرنے کو ظاہر کرتا مخلوق کے وجود میں دوسری چیز پیدا کرنے کے لئے جعل کا فعل استعمال ہوا ہے۔ اگر مخلوق کا وجود نہ

ہوتو اس میں دوسری کوئی چیز پیدا نہیں کی جاتی اس کی مثال سورۃ الانعام کی آیۃ: 1 ہے۔ ﴿الحمد لله الذی خلق السماوات والارض وجعل الظلمات والنور﴾ آسمان وزمین کے وجود کے بعد ہی ظلمات اور نور کو پیدا کیا گیا ہے۔ ان کا وجود نہ ہوتو ظلمات ونور کا بھی وجود نہ ہو۔

(لعل؛ اور؛ عسیٰ؛ کا استعمال)

لعل؛ اور؛ عسیٰ؛ کو امید اور طمع کے معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جب مخلوق کو کسی ممکن امر کے وقوع میں شک ہوتو وہ اللہ تعالیٰ سے امید اور طمع کے ساتھ رجوع کرتے ہیں۔

(ا) کسی چیز کے یقینی حصول کے لئے ان کا استعمال ہوتا ہے۔

(ب) ان سے امید ظاہر کی جاتی ہے۔ اور امید اس ذات سے کی جاتی ہے۔ جو امید برآری پر قادر ہو۔

(ج) لعل؛ بہت سے مقامات پر کسی نتیجے کے سبب پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے سورۃ الاسرآء کی آیت: 79 میں ارشادِ ربانی ہے۔ ﴿عسیٰ أن یبعثک ربک مقاما محمودا﴾ سورۃ المآئدۃ کی آیۃ: 100 میں ہے۔ ﴿فاتقوا الله یا اولی الالباب لعلکم تفلحون﴾ لہذا ڈرو اللہ سے اے عقل مندو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ (نجات پا جاؤ)

(12) السؤال: الفرق بین المحکم والمتشابہ پر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تا کہ وہ تمام جہان والوں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈرائے۔ لوگوں پر اپنے فضل وکرم سے اصول الدین کو مضبوطی عطا فرمائی تا کہ ان کا عقیدہ آلودگی سے محفوظ رہے اور ان پر صراط مستقیم واضح ہو جائے۔ ایسی آیات جن میں اختلاف اور تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اُم الکتاب ہیں۔ ﴿کتاب فصلت آیاتہ قرآنا عربیا لقوم یعلمون 3۔ فصلت﴾ (یہ ایسی) کتاب ہے جس کی آیات کی تفصیل کی گئی ہے۔ (اسے) عربی زبان میں ایسے لوگوں کے لئے (نازل) کیا گیا ہے جو (عربی زبان کو) جانتے ہیں۔ محکم آیات کو قرآن میں مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے مگر چونکہ وہ اصول دین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کا معنیٰ ومفہوم یکساں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہوتا۔

انکے علاوہ جو فروع الدین پر مشتمل آیات ہیں ان میں تشابہ ہوتا ہے۔ ان سے پختہ علم والے لوگ ہی مسائل کا استنباط کر سکتے ہیں عام لوگ انکی تاویل وتعبیر کے مکلف نہیں ہیں ان کے لئے تو یہی

لازم ہے کہ ان پر بغیر کسی تاویل کے ایمان لائیں۔

(الاحکام العام والتشابہ العام)

محکم کا معنی مضبوط اور حکم کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان جدائی کر دینا۔ اسی سے، حاکم : ہے۔ جو ظالم کو ظلم سے روکتا ہے اور دو مخالف فریقوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ احکام الکلام کا معنی اس کی مضبوطی ہے۔ جس سے جھوٹ اور صدق کے درمیان پہچان حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معنی میں پورے قرآن کو محکم قرار دیا ہے۔ یعنی قرآن ایسا مضبوط اور فصیح کلام ہے۔ جو حق و باطل اور صدق و کذب کے درمیان تمیز پیدا کرتا ہے۔ اور یہی احکام العام ہے۔

☆ متشابہ تشابہ سے مشتق ہے۔ تشابہ کا مفہوم کسی چیز کا دوسری چیز کے ساتھ کسی وصف میں موافق ہونا۔ یکساں ہونا۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے بعض اعضاء آنکھ، کان، پاؤں اور پنڈلی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اسی طرح جنت دوزخ کا ذکر ہے۔ جنت کے پھلوں کا ذکر ہے۔ کہ وہ رنگ و صورت میں دنیا کے پھلوں کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ مگر ان کا ذائقہ ان سے مختلف ہے۔ مسلمانوں کے لئے نظروں سے اوجھل غیب کی ان چیزوں پر بغیر کسی چھان بین کے ایمان لانا واجب ہے۔ مگر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہ چیزوں کی حقیقت کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ کہ اللہ کی آنکھ کتنی بڑی ہے۔ کان کتنے بڑے ہیں وغیرہ۔ حالانکہ وہ اس پیمائش کے مکلف نہیں ہے۔ التشابہ العام سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے حصہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس معنی میں پورا متشابہ ہے ﴿اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا﴾ (الزمر:23) اللہ نے بہترین حدیث (کلام کو) نازل کیا ہے (یہ ایسی) کتاب ہے۔ کہ اس (کے بعض حصے) دوسرے حصوں سے ملتے جلتے ہیں۔ حکم کے لحاظ سے پورا قرآن محکم ہے اور اس کے بعض حصے دوسرے حصوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لحاظ سے پورا قرآن متشابہ بھی ہے۔

(الاحکام الخاص اور التشابہ الخاص کے درمیان فرق)

(ا) محکم وہ آیت ہے جس کی مراد واضح ہو۔ اور متشابہ وہ آیت ہے جس کی حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو یا راسخون فی العلم ہی کو حاصل ہے۔

(ب) محکم وہ آیت ہے۔ جس کی ایک ہی وجہ اور سبب معلوم ہو اور متشابہ وہ آیت ہے۔ جس کی تاویل و تعبیر کے کئی ایک طریقے ہوں۔

(ج) محکم وہ آیت ہے۔ جو اپنا مفہوم واضح کرنے میں وضاحت کی محتاج نہ ہو متشابہ وہ آیت ہے۔
جو اپنی وضاحت کے لئے تاویل و تعبیر کی محتاج ہو۔ بذاتِ خود اس میں وضاحت نہ ہو۔
محکم کی مثال میں ناسخ، حلال و حرام، حدود و فرائض اور وعدہ و وعید پر مشتمل آیات ہوتی ہیں۔
اور متشابہ آیات میں منسوخ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی کیفیات داخل ہیں۔ جیسے ارشاد
ربانی ہے ﴿ الرحمان علی العرش استوی ﴾ (طہ:5) اس میں مسلم مکلف نہیں ہے
کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے اور بیٹھنے کی پوزیشن کی ٹوہ لگائے۔

(الاختلاف فی معرفۃ المتشابہ)

والراسخون فی العلم کی واؤ کو بعض علماء استنافیہ کہتے ہیں۔ اور ﴿ وما یعلم تاویلہ
الا اللہ ﴾ پر وقف کرتے ہیں۔ بعض واؤ کو حرف عطف کہتے ہیں بعض اسے واؤ حالیہ کہتے
ہیں۔ اور ﴿ والراسخون فی العلم ﴾ پر وقف کرتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے
کہ رسول اللہؐ نے اس آیت کی تلاوت کی: ﴿ ھو الذی انزل علیک الکتاب الی
قولہ اولو الالباب ﴾ اس آیت میں، فاحذرھم: کا لفظ بھی ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: جب
تو ان لوگوں کو دیکھے۔ جو متشابہ آیات کے پیچھے لگتے ہیں (ان کی ٹوہ لگاتے ہیں) تو ان سے
کنارہ کشی کر۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کا نام لیا ہے۔ کہ ان سے بچاؤ کیجئے۔ (اخرجہ البخاری
ومسلم وغیرھما) امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں (والراسخون فی العلم) کو معطوف ہی قرار
دیا ہے۔

(التوفیق بین الرائین بفھم معنی التاویل)

تاویل کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔
الاول۔ لفظ احتمال راجح سے کسی قرینے کی بناء پر احتمال مرجوح کی طرف پھیر دینا۔
الثانی۔ تاویل کا معنی تفسیر ہے جس سے کلام کا ربط ظاہر کیا جاتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات
کے بارے میں جو صفات بیان کی ہیں۔ وہ مخلوق کی صفات سے متشابہ نہیں ہیں۔ اس لئے
فرمانِ باری ہے ﴿ لیس کمثلہ شیء ﴾ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ اپنے
رکوع و سجود میں: سبحنک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی: پڑھا کرتے
تھے۔ رسول اللہؐ امر قرآن ﴿ فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا۔
3۔ النصر ﴾ کی تاویل کے طور پر رکوع و سجود میں مذکورہ بالا تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ اللہ نے

یوم آخر کے بارے میں کوئی خبریں دی ہیں۔ان کی وہی حقیقت ہے ان میں تاویل کا کوئی دخل نہیں ہے۔اللہ نے جنت کی جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔غیر متعفن پانی۔دودھ اور شہد کی نہریں وغیرھا۔ہم ان پر بغیر کسی چھان بین کے ایمان لاتے ہیں۔ان کے ذائقے اور کیفیت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ہماری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم ان کی کیفیات کی جستجو کرتے پھریں۔امام مالک رحمہ اللہ سے کسی نے ﴿الرحمان علی العرش استویٰ﴾ کے بارے میں پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے اور بیٹھنے کی کیا کیفیت ہے؟ تو فرمایا: الاستوآء معلوم ہے۔اور کیفیت مجہول (نامعلوم) ہے۔اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔یہی عقیدہ سب سلف صالحین کا ہے۔

(التاویل المذموم)

- کچھ کج بحث لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے اعضاء کے بارے میں تاویلات کی ہیں۔وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کی قدرت کاملہ سے تاویل کرتے ہیں۔اور کانوں آنکھوں کی تاویل کرتے ہیں۔ کہ اُسے فرشتوں کے ریکارڈ سے مخلوق کے اعمال کا علم ہوتا ہے۔وہ خود اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھتا اور کانوں سے کچھ نہیں سنتا یہ سب تاویلات مذموم اور باطل ہیں۔

(13) السؤال:۔العام والخاص پر مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔کبھی ایسا حکم ہوتا جو تمام افراد پر نافذ ہوتا ہے۔اسے حکم عام کہا جاتا ہے۔جو ہر حالت میں لاگو ہوتا ہے۔اور کبھی حکم تو عام ہوتا ہے مگر خاص افراد پر لاگو ہوتا ہے۔ایسے حکم کو حکم خاص کہا جاتا ہے۔

(تعریف العام وصیغ العموم)

العام ایسا لفظ ہے جس میں حصر نہیں ہوتا بلکہ اس کا نفاذ مطلقاً بلا قید ہوتا ہے۔اکثر علماء کا مذہب ہے کہ عموی معنیٰ کے لئے لغۃً کچھ الفاظ وضع کیے گئے ہیں۔اور انہیں مجازاً دوسرے معانی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اس کی تائید میں وہ منصوص دلائل پیش کرتے ہیں۔

(1) اھل کا لفظ نوح علیہ السلام نے عام قرار دے کر اپنے بیٹے کے بچاؤ کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ العنکبوت کی آیۃ:33 میں لوط علیہ السلام کے خاندان کو؛اھل؛کے لفظ سے اضافت کی ہے۔اس لئے نوح علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹے کو اپنے ؛اھل؛ میں شمار کیا۔مگر اس لفظ عام کا اطلاق خاص افراد پر ہوتا ہے۔اور یہاں اس کا

استعمال مجازاً کیا ہے۔ ﴿انه ليس من اهلك﴾ اس میں اھل کے لفظ کو خاص معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ جب عذاب کے فرشتوں کو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بستی میں تو میرا بھتیجا لوط علیہ السلام بھی ہے۔ تو فرشتوں نے جواب دیا کہ ہم اُسے اور اس کے :اھل: کو ضرور بچالینگے۔ سوائے ان کی بیوی کے۔ تو اس میں بھی لفظ اھل عام ہے۔ مگر اس کا اطلاق خاص افراد (لوط علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں) پر ہوا ہے۔

یہ دوسری مثال لفظ عام کا اطلاق خاص افراد پر ہونے کی ہے۔

(ب) اجماع صحابہ کی دلیل: ﴿الزانية والزاني فاجلدوا كل واحدة منهما مائة جلدة . النور . 2﴾ اس آیت میں حکم عام ہے۔ مگر محصن (شادی شدہ) مسلمان پر یہ حکم عام لاگو نہیں ہوتا اس لئے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کو سنگسار کیا جاتا ہے۔

(ج) الفاظ شرط و استفہام سے کوئی حکم عام ثابت نہیں ہوتا۔ ہم :کل، اور بعض: کا فرق بھی جانتے ہیں۔ ہر جگہ :کل، کا لفظ تمام افراد کو شامل نہیں ہوتا اسی طرح :بعض: کے لفظ سے ہر جگہ ایک ہی فرد مراد نہیں ہوتا۔ کسی مقام پر :بعض: کے لفظ سے ایک سے زیادہ افراد مراد ہوتے ہیں۔

☆ الف لام تعریف کے ساتھ عام خاص کی دلیل: ﴿والعصر ، ان الانسان لفی خسر . العصر : 2،1﴾ یعنی کل انسان فی خسر۔ اس حکم عام میں تمام افراد انسان شامل ہیں۔ مگر بعد والی آیت سے ایمانداروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اس حکم عام کا اطلاق خاص افراد (بے ایمانوں پر) ہوتا ہے۔

☆ نکرہ کی نفی اور نہی کے سیاق و سباق کی مثال: ﴿فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج﴾ البقرۃ: 197۔ رفث، فسوق اور جدال میں ان الفاظ کے تمام فروع شامل ہیں۔ یہ حکم عام کی مثال ہے۔ مگر غیر حج کے ایام میں رفث کی اجازت ہے۔

الذی والتی اور ان کے فروع۔ ﴿والذي قال لوالديه اف لكما﴾ الاحقاف: 17۔ اس حکم عام میں تمام انسان شامل ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بعد جمع کا صیغہ ہے۔ ﴿اولئک الذین حق علیهم القول . الاحقاف : 18﴾

☆ جب اسم جنس کسی معرفہ کی طرف مضاف ہو تو وہ اس کے تمام افراد کو شامل ہوگا۔ جیسے سورۃ النور کی آیۃ: 63 ہے۔ ﴿فليحذر الذين يخالفون عن امره﴾ اس میں :امر: اسم جنس ہے اور یہ معرفہ کا مضاف ہے۔ اس لیے اللہ کے تمام اوامر کو شامل ہے۔

(اقسام العام)

عام کی تین قسمیں ہیں:۔

الاول:۔ اس میں عموم باقی رہتا ہے۔ جیسے ﴿حرمت علیکم امھاتکم : 23النساء﴾ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔

الثانی:۔199:﴿ثم افیضوا من حیث افاض الناس﴾ الناس سے مراد ابراہیم علیہ السلام یہ قریش کے علاوہ تمام اہل عرب ہیں۔

الثالث:۔ العام المخصوص:۔ اس کی مثال سورۃ آل عمران کی آیۃ: 97 ہے:﴿وللہ علی الناس﴾ ، سے حکم عام معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس حکم سے مراد وہ خاص لوگ ہیں۔ جو سفر خرچ کی طاقت رکھتے ہوں۔ عام لوگ مراد نہیں ہیں۔

(الفرق بین العام المراد بہ الخصوص والعام المخصوص)

اس فرق کی درج ذیل تین وجوہ ہیں:۔

(1) ایک عام سے مراد خصوصی فرد ہوتا ہے۔ اس سے تمام افراد مراد نہیں لیے جاتے۔ نہ لفظ کے اعتبار سے اور نہ معنوی حکم کے لحاظ سے۔ رہا العام المخصوص تو اس لفظ کے اعتبار سے وہ تمام افراد کو شامل ہوتا ہے۔ حکم کے اعتبار سے نہیں۔

مثال:۔﴿الذین قال لھم الناس﴾ اس میں الناس عام ہے۔ مگر اس کے لفظ اور حکم میں تمام لوگ شامل نہیں ہیں۔ الناس: سے لفظاً وحکماً ایک ہی فرد نعیم ابن مسعود مراد ہے۔

(1) پہلا فرق قطعاً مجاز ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لفظ کو اصل موضوع سے ہٹا کر بعض افراد پر اطلاق کیا گیا ہے۔

(2) دوسرا فرق العام المخصوص کا سب افراد پر شامل ہونا یہ حقیقتاً زیادہ صحیح ہے۔ یہی مذہب امام الحرمین عبدالملک بن ابی عبداللہ بن یوسف بن محمد الجوینی، امام شافعی اور ان کے صحابہ کا ہے۔ لہذا اس کا تناول (شمولیت) حقیقی ہے۔

(تعریف الخاص وبیان المخصص)

الخاص العام کی ضد ہے۔ اور اس میں متناسبت اور خاص افراد شامل ہوتے ہیں۔ اور ان کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ لفظ العام کے بعض افراد کو حکم سے خارج کرتا ہے۔ مخصص یا متصل ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا امر ہوتا ہے۔ کہ اس میں عام اور مخصص کے درمیان کسی لفظ فاصل سے جدائی نہ کی گئی ہو۔ یا مخصص منفصل ہوتا ہے۔ اور وہ عام کے خلاف ہوتا ہے۔ مخصص متصل

کے لئے پانچ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ایک الاستثناء ہے۔جیسے ارشاد ربانی ہے۔﴿ والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یأتوا باربعۃ شھدآء فاجلدوھم ثمانین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا واولئک ھم الفاسقون الا الذین تابوا﴾ (سورۃ النور 5-4)
اور وہ لوگ جو پاکدامن عورتوں پر (بدکاری) کا الزام دیتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے انہیں اسی (80) کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو وہ لوگ نافرمان ہیں۔مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں۔(وہ اس سزا سے مستثنیٰ ہیں۔

دوسرا مخصص صفت ہے۔جیسے سورۃ النسآء کی آیۃ 23 ہے:﴿ وربٰئبکم الاتی فی حجورکم من نسآئکم الاتی دخلتم بھن ﴾ اور تمہاری لے پالک بیٹیاں جو تمہاری ان بیویوں سے جن پر تم نے دخول کیا ہو (وہ بھی تم پر حرام ہیں) اس آیت میں: اللاتی دخلتم بھن تمہاری بیویوں کی صفت ہے۔اگر بیویوں کی یہ صفت نہ ہو تو ان کی لے پالک بیٹیوں سے نکاح جائز ہے۔اس میں صفت مخصص متصل ہے۔

تیسرا مخصص حرف شرط ہے۔جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ 180 ہے:﴿ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین ﴾ اس میں حرف شرط ان کے ذریعے تخصیص کردی گئی ہے۔کہ اگر مرنے والے کا کوئی ترکہ ہو تو وصیت کا پابند ہے۔اگر کوئی نہ ہو تو وہ وصیت کے حکم سے مستثنیٰ ہے۔یہ بھی مخصص متصل کی مثال ہے کہ وصیت کے حکم سے متصل ہی اس کا بلافصل ذکر ہے۔

چوتھا مخصص کسی امر کی انتہا ہے۔جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ:222 ہے:﴿ولا تحلقوا رؤوسکم حتی یبلغ الھدی محلہ ﴾ جب تک قربانی اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے تم اپنے سروں کے بال نہ مونڈو۔اس میں قربانی کے انتہائی وقت کا ذکر ہے۔یعنی جب تک دس ذی الحجہ کو قربانی نہ ہو جائے۔اس وقت تک سر مونڈنے کی اجازت نہیں ہے۔

☆ مخصص منفصل وہ ہے جو حکم والی آیت سے ہٹ کر کسی فاصلے پر مذکور ہو۔یا اس کے بارے میں کوئی حدیث،اجماع یا قیاس ہو۔جس حکم کو قرآن ہی کے ذریعے خاص کردیا گیا ہو تو وہ حکم عام کی حیثیت رکھتا ہے۔جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 228 ہے:﴿والمطلقٰت یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء ﴾ یہ حکم عام ہر مطلقہ پر لاگو ہے۔وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ

۔مدخولا ہو یا غیر مدخولا بہا ہو۔ پھر سورۃ الطلاق کی آیۃ :4 کے ذریعے تخصیص کر دی گئی کہ اگر مطلقہ حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ تین قروء نہیں ہے۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب کی آیۃ :89 سے جس عورت کو چھوا تک نہ ہو وہ کسی عدت کی پابند نہیں ہے۔

حدیث کے ذریعے تخصیص کی مثال: سورۃ البقرۃ کی آیۃ :275: ﴿ واحل اللہ البیع وحرم الربوا ﴾ اس میں بیع کو مطلقاً حلال قرار دیا گیا ہے۔ مگر حدیثِ رسولؐ نے بعض فاسد بیوع کو حرام قرار دیا ہے۔ بخاری میں جس کے بارے میں کئی روایات ہیں۔ نر کی جفتی کی مزدوری لینا، حبل الحبلہ کی بیع اور ام الولد کی بیع وغیرہ کو حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔

اجماع سے تخصیص کی مثال: سورۃ النساء کی آیۃ المواریث نمبر 11 ہے: ﴿ یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین ﴾ اجماع سے غلام کو وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے ۔سورۃ نور کی آیۃ نمبر 2 ہے۔ ﴿ الزانیہ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مأۃ جلدۃ ﴾ اس سے غلام مرد کو لونڈی پر قیاس کر کے اس کے لئے پچاس کوڑے سزا مقرر کی گئی ہے۔

(تخصیص السنۃ بالقرآن)

حدیث میں ہے: نبیؐ نے فرمایا: زندہ جانور کا جو حصہ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے۔ اس کی سورۃ النحل کی آیۃ :80 نے تخصیص کر دی۔ ﴿...... ﴾ اور (بھیڑوں کی) ریشم، اونٹوں اور بکریوں کے بالوں سے ایک وقت تک سامان تیار کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ماقُطع میں یہ بال بھی شامل ہیں۔ (رواہ ابوداود والترمذی) ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

اجماع کے دلائل کی مثال: حضرت فاطمہؓ نے سورۃ النساء کی آیۃ نمبر 11 کی رو سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے باپ کی میراث کا حصہ طلب کیا۔ تو صحابہؓ کے اجماع کی وجہ سے خلیفۃ الرسولؐ نے اس مطالبے کا انکار کر دیا۔ کہ اس پر صحابہؓ کا اجماع ثابت تھا۔ کہ نبیؐ نہ کسی کی میراث سے حصہ پاتا ہے اور نہ اسکے ترکہ سے اولاد کچھ حصہ پاتی ہے۔ بلکہ نبیؐ جو کچھ چھوڑتا ہے وہ صدقہ شمار ہوتا ہے۔ یہ حدیث کا مفہوم ہے جو بخاری مسلم میں مروی ہے۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ العام تخصیص سے پہلے افراد کو شامل ہوتا ہے۔ تخصیص کے بعد العام مخصوص افراد کے لئے حجۃ ہوتا ہے۔

(خطاب کن افراد کو شامل ہوتا ہے؟)

سورۃ المآئدۃ کی آیۃ :41 ہے:﴿ یآ ایھا الرسول لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر ﴾ اے رسولؐ! جولوگ کفر کو تیزی سے اختیار کرتے ہیں (ان کا عمل) آپ کو غمزدہ نہ کرے۔ کیا یہ خطاب پوری امت کو شامل ہے یا نہیں؟

(ا) کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ خطاب نبی کی وساطت سے پوری امت کو شامل ہے۔اس لئے نبیؐ امت کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔

(ب) کچھ لوگوں کا مذہب ہے کہ یہ خطاب امت کو شامل نہیں ہے۔اسلئے کہ خاص صیغے کے ساتھ رسول اللہؐ سے خطاب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خطاب یآ ایھا الناس کے صیغے سے کیا گیا ہے۔ اس میں رسول اللہ بھی شامل ہیں؟ صحیح رائے یہ ہے کہ اس خطاب میں رسول اللہ بھی شامل ہیں۔ بعض علماء نے اس طرح فیصلہ کیا ہے۔ کہ جس خطاب سے پہلے ؛لفظ قل ، ملا ہوا ہو اس میں رسول اللہؐ شامل نہیں ہوتے اس لئے کہ اللہ نے رسول اللہؐ کے ذریعے مقولے کی تبلیغ کا حکم دیا ہوتا ہے۔ اور خطاب سے ؛قل ؛ کا صیغہ نہ ہو۔ تو اس میں رسولؐ بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ عقل کو اپیل کرتا ہے۔ جس خطاب کی نسبت لوگوں یا مؤمنین کے ساتھ ہو اس میں رسول اللہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ المآئدہ کی آیۃ :90 ہے﴿ یآ ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیراہ ﴾ اس میں بھی رسول اللہؐ شامل ہیں۔ قرآن کریم میں اکثر خطابات تذکیر کے ساتھ وارد ہیں۔ مگر ان میں مؤنثات بھی شامل ہوتی ہیں۔ کبھی وضاحت کے لئے تانیث کا الگ صیغہ بھی ذکر کیا ہوا ہے۔ جیسے سورۃ النساء کی آیۃ :124 ہے:﴿ ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ ﴾ جو بھی مرد یا عورت نیک عمل کریگا۔ اور وہ مومن بھی ہو۔ تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کھجور کی گٹھی کے شگاف کے برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

(14) السؤال :۔ ناسخ اور منسوخ پر مفصل نوٹ لکھئے۔

الجواب :۔ آسمانی شریعتیں انسانی عبادات ومعاملات اور عقائد کی اصلاح کے لئے نازل ہوتی ہیں۔ کسی دور میں کوئی شریعت کسی امت کے لئے مناسب اور دوسری امت کے لئے نامناسب ہوتی ہے۔ مگر ایک بنیادی امر ہر شریعت میں یکساں رہا ہے۔ اور وہ توحید الوھیت ہر رسول نے

احکام شریعت کے اختلاف کے باوجود تبلیغ کی ابتداء توحید الٰھیت سے کی ہے۔ کہ عبادت کے لائق ایک ہی ذات واللہ ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیہ نمبر 25 میں اس بنیادی امر کا ذکر ہے۔ ﴿ وما ارسلناک من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا أنا فاعبدون ﴾ اور ہم آپؐ سے پہلے ہر نبی کیطرف وحی کرتے تھے۔ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہذا میری ہی عبادت کرو۔ پھر اللہ تعالیٰ جو احکام شریعت دوسری امت کے مناسب حال نہیں ہوتے تھے انہیں منسوخ کر دیتا تھا۔

(تعریف النسخ وشروطہ)

نسخ کا لغوی معنی ہے۔ ایک چیز کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔ اس سے نسخت الکتاب ہے جب کسی کتاب سے کچھ نقل کیا جاتا ہے۔ تو نقل کرنے والا کہتا ہے۔ نسخت الکتاب۔ میں نے کتاب کو لکھ کر نقل کیا۔ سورۃ الجاثیہ کی آیت: 29 ہے: ﴿ انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون ﴾ ہم تمہارے اعمال کو لکھتے رہے ہیں۔ یعنی تمہارے اعمال اعمال ناموں میں نقل کرتے رہے ہیں۔

نسخ کا اصطلاحی معنی ہے: کسی حکم کو دوسرے شرعی حکم کی بناء پر اٹھا دینا۔ ختم کر دینا۔ سورۃ البقرۃ کی آیہ: 106 ہے: ﴿ ما ننسخ من آیۃ ﴾ ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں تو اس کی جگہ اور مناسب آیہ نازل کر دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ آیت فلاں آیت کی ناسخ ہے۔ منسوخ آیت کی مثال وہ آیت ہے جس میں والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کا پہلے حکم دیا گیا پھر آیہ المواریث سے وصیت کو منسوخ کر دیا گیا نسخ کے لئے درج ذیل شرائط ہیں:۔

(1) شرعی طور پر حکم منسوخ ہو۔ (2) نسخ پر شرعی دلیل موجود ہو۔ (3) جس حکم کو منسوخ کیا گیا ہو اس کا حکم کسی مقرر وقت کے ساتھ مقید نہ ہو۔ ورنہ وہ حکم اپنے مقرر وقت تک نافذ رہے گا۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیہ: 109 ہے: ﴿ فاعفوا واصفحوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ ﴾ سو تم درگذر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔ یہ صبر اور درگذر کرنے کا حکم ان کفار مکہ کے بارے میں دیا گیا ہے جو ظلم وستم سے کمزور مسلمان رسول اللہؐ سے ان کفار کے ساتھ لڑنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس لئے اللہ نے درگزر کرنے کے حکم کو اپنا فیصلہ صادر کرنے کے وقت کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔ لہذا ایسا حکم منسوخ نہیں ہوتا۔

﴿ما یقع فیہ النسخ ؟﴾

نسخ اوامر ونواہی میں ہوتا ہے عقائد اور اصول الدین میں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اصول دین ہر امت میں یکساں اور غیر متبدل رہے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الشوریٰ کی آیۃ: 13 میں تمام رسولوں کی شریعت کو یکساں قرار دیا گیا ہے۔ روزے، حج اور قصاص کا حکم تمام امتوں میں نافذ تھا۔ اسی طرح اخلاقی اقدار بھی تمام امتوں میں یکساں رہی ہیں۔ اسی طرح وعدے اور وعید کی آیات میں بھی نسخ ہوتا ہے۔

(نسخ پہچاننے کا ذریعہ اور اس کی اہمیت)

فقہاء و متکلمین کے نزدیک نسخ کی معرفت بہت ضروری ہے۔ مروی ہے کہ حضرت علیؓ کا گزر ایک قاضی کے پاس سے ہوا تو آپؓ نے قاضی سے پوچھا: کیا آپ نسخ کو جانتے ہیں؟ اُس نے کہا: نہیں: تو حضرت علیؓ نے فرمایا: تو خود بھی برباد ہوا اور لوگوں کو بھی برباد کیا۔ سورۃ البقرۃ کی ایۃ: 269 میں ہے: جس شخص کو حکمت عطا کی جاتی ہے تو (سمجھو) کہ اُسے خیر کثیر عطا کی گئی ہے۔ ابن عباسؓ نے خیر کثیر کی تفسیر کی ہے: کہ خیر کثیر ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، مقدم و مؤخر، اور حرام اور حلال کا علم اور معرفت ہے۔

☆ ناسخ و منسوخ کی معرفت کے کئی طریقے ہیں:۔

(1) نبی یا کسی صحابی سے صراحت: صراحت نبی کی مثال: حدیث: نھیتکم عن زیارۃ القبور الا فزوروھا۔ رواہ الحاکم۔ صحابی کی صراحت۔ حضرت انسؓ کا قول ہے: جو بئر معونہ پر شہید ہونے والوں کے قصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جنت میں ان کا قول کہ ہم سے اللہ راضی ہوا اور ہم اللہ سے راضی ہیں۔ ہمارے بھائیوں کو یہ خوشخبری سنا دیجئے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ان کے یہ الفاظ قرآن میں درج تھے۔ پھر منسوخ کر دیے گئے۔

(2) اجماع امت کہ یہ آیت ناسخ اور یہ آیت منسوخ ہے۔

(3) تاریخی طور پر مقدم اور متاخر آیت کی معرفت۔

نسخ میں اجتہاد، قول مفسرین، ظاہر طور پر متعارض دلائل اور دو راویوں میں سے ایک کا اسلام میں متاخر ہونا اور ان امور پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔

(نسخ کے بارے میں مختلف آراء اور اس کے ثبوت کے دلائل)

اس بارے میں لوگوں کی چار اقسام ہیں۔

(1) یہود: انکا خیال تھا کہ نسخ کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے کار ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پہلے جو حکم نازل کرتا ہے۔ اس میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ ان کی یہ رائے فاسد اور باطل ہے اس لئے کہ نسخ میں بھی اللہ کی حکمت ہوتی ہے۔ حالانکہ یہودی خود اعتراف کرتے ہیں: کہ شریعت موسیٰ علیہ السلام پہلی تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔

(2) روافض ہیں۔ انہوں نے نسخ میں بہت غلو کیا ہے۔ انکا عقیدہ ہے۔ کہ قرآن میں جو آیات اہل بیت اور حضرت علیؓ کے حق میں نازل ہوئی ہیں انہیں شیخین (ابوبکر و عمرؓ) نے قرآن سے محو کر دیا تھا۔ یہ ان روافض کی انتہائی گمراہی کی علامت ہے۔

(3) ابو مسلم الاصفہانی: یہ نسخ کو عقلاً جائز سمجھتا ہے۔ اور شرعاً اس کے وقوع کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ یہ مشہور معتزلی تھا۔ یہ 322ھ میں فوت ہوا۔

(4) جمہور العلماء: عقلاً اور شرعاً نسخ کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کے افعال انسانی مصلحت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں انسانی اغراض کی طرح کوئی اغراض پنہاں نہیں ہوتیں۔

(2) قرآن وسنت کی نصوص جواز نسخ کے وقوع پر دلالت کرتی ہیں۔

(ا) سورۃ النحل کی آیۃ: 101۔ جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت سے بدل دیتے ہیں۔

(ب) حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں۔ میں نے جو آیات نبیؐ سے سنی ہیں۔ ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑتا۔

اقسام النسخ

نسخ کی چار اقسام ہیں:۔

پہلی قسم:

- قرآن کا قرآن سے نسخ۔ پہلے بیوہ کی عدت ایک سال تھی۔ پھر چار ماہ دس دن کی عدت نے پہلی آیت منسوخ کر دی۔

دوسری قسم:

قرآن کا نسخ سنت کے ساتھ۔ اسکے تحت دو اقسام ہیں۔

(ا) اخبار آحاد کے ذریعے قرآن کا نسخ۔ جمہور اس کو جائز نہیں جانتے۔ اس لئے کہ قرآن متواتر ہے اور آحاد ظنی الثبوت ہیں۔ لہذا متواتر کا ظن سے نسخ صحیح نہیں ہے۔

(ب) نسخ القرآن بالسنۃ المتواترہ۔ امام مالک، ابوحنیفہ اور امام احمد رحمھم اللہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

قرآن پورے کا پورا وحی ہے۔سورۃ النحل کی آیۃ:44 ہے: ﴿ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزّل الیھم﴾ ہم نے آپ کی طرف ذکر(قرآن) نازل کیا ہے۔تاکہ جو لوگوں کی طرف نازل کیا گیا ہے۔اس کی آپ وضاحت کردیں۔

اور نسخ بھی وضاحت ہی کی ایک قسم ہے۔

تیسری قسم:

نسخ السنۃ بالقرآن۔اسے جمہور علماء جائز سمجھتے ہیں۔نماز میں بیت المقدس کیطرف رخ کرنا سنت سے ثابت ہے۔پھر سورۃ البقرۃ کی آیۃ:144 کے ذریعے اس رخ کو منسوخ کردیا گیا

﴿ فولّ وجھک شطرا المسجد الحرام ﴾

چوتھی قسم:

نسخ السنۃ بالسنۃ۔اسکے تحت چار انواع ہیں۔

(1) نسخ متواترہ بمتواترۃ۔(2) نسخ آحاد بآحاد۔(3) نسخ آحاد بمتواترۃ۔(4) نسخ متواترۃ بآحاد۔پہلی تین اقسام جائز ہیں۔اور چوتھی قسم جائز نہیں ہے۔اجماع اور قیاس سے نسخ صحیح نہیں ہے۔

(السؤال۔قرآنی نسخ کی انواع پر بحث کیجئے۔)

الجواب:۔قرآنی نسخ کی تین انواع ہیں۔

الاول:۔

تلاوت اور حکم دونوں کا منسوخ ہونا۔اس کی مثال: حضرت عائشہؓ کی روایت ہے۔جسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔قرآن میں پہلے دس رضعات کا ذکر تھا۔کہ ان سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔پھر پانچ رضعات کی آیت نازل ہوئی۔تو وہ بھی تلاوت اور حکم کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔اب مصحف عثمانی میں وہ آیت موجود نہیں ہے(رضعات رضعۃ کی جمع ہےجس کا معنی ہے۔بچے کا ایک دفعہ چھاتی سے بھوک مٹانے کیلئے دودھ چوسنا۔اس طرح پانچ دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت ثابت ہوتی ہے)

الثانی:۔

تلاوت کا باقی رہنا اور حکم کا منسوخ ہونا۔اس کی مثال: آیۃ العدۃ کے حکم کا منسوخ ہونا اور اس

کی تلاوت کا باقی رہنا۔ اس بارے میں کئی کتابیں تالیف کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے۔ کہ حکم کو ختم کرنے اور تلاوت کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب دو طریقوں سے دیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کی تلاوت کی باقی ہے۔ تا کہ اس سے کوئی حکم معلوم ہو۔ اگر کوئی حکم منسوخ کر دیا جائے تو آیت کو باقی رکھنے سے اس کی تلاوت پر ثواب حاصل ہوتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے: کہ نسخ حکم سے تخفیف مشقت مراد ہے۔ عمل سے پہلے نسخ حکم نبیؐ سے مشورہ سے پہلے صدقہ کے حکم کی طرح ہے۔ جس پر ایمان لانا اطاعت کا تقاضا ہے۔

تیسری نوع:۔

تلاوت کا منسوخ ہونا اور حکم کا باقی رہنا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ان میں سے ایک مثال آیہ الرجم ہے۔ الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم "بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت (دونوں شادی شدہ مرد و عورت) اگر زنا کریں تو ان دونوں کو رجم (سنگسار) کر دو۔ (یہ) اللہ کی طرف سے سزا ہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے بئر معونہ پر شہید ہونے والے ستر قاریوں کا کلام بھی قرآن میں وارد تھا۔ ﴿ بلغوا عنا قومنا انا لقینا ربنا فرضی عنا وارضانا ﴾ پھر قراء کا قول تلاوت قرآن سے منسوخ کر دیا گیا۔

اس نسخ کے بارے میں آحاد احادیث وارد ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آحاد سے متواتر کو نسخ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ مفسر اور مجتہد کے قول سے نسخ قبول کیا جا سکتا ہے جب متقدم اور متاخر آیات کی تاریخ کا علم ہو تو پھر نسخ کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ دونوں اقوال صحیح نہیں ہیں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ جو آیت منسوخ ہوتی ہے اس کا حکم بھی لازماً منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر شارع نے تلاوت کے نسخ اور حکم باقی رہنے کی کوئی دلیل واضح نہ کی ہو۔ تو یہ تلازم تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اگر شارع نے کوئی صریح دلیل پیش کر دی ہو تو تلازم کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(حکمۃ النسخ)

(1) بندوں کی مصلحتوں کی رعایت۔ (2) شریعت کا بدرجہ کمال تک ترقی پانا۔ دعوت کا بتدریج ترقی پانا اور لوگوں کی حالت کا بتدریج کمال تک پہنچنا۔

(3) مکلفین کی آزمائش اطاعت اور عدم اطاعت میں ان کا جائزہ لینا۔

(4) امت کیلئے آسانی پیدا کرنا۔ اگر نسخ میں زیادہ مشقت ہو تو زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ اور اگر تخفیف ہو تو امت کو آسانی حاصل ہوگی۔

(النسخ الی بدل والیٰ غیر بدل)

نسخ یا تو پہلے حکم کے مطابق ہوتا یا اس سے ہلکا۔ یا اس سے بھاری (مشکل) ہوتا ہے۔

(1) غیر بدل نسخ کی مثال:۔ رسول اللہؐ سے مشورہ کرنے سے پہلے صدقہ پیش کرنے کا نسخ۔ اس کے بعد اسی طرح کا کوئی اور بدل پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ اسے ختم ہی کر دیا گیا۔ اس کا بعض معتزلہ اور ظاہریہ نے انکار کیا ہے۔ دلیل میں سورۃ البقرۃ کی آیۃ :106 پیش کی ہے۔ جس میں فرمانِ باری ہے کہ ہم بھی منسوخ کرتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل کوئی آیت نازل کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت سے بہتر حکم نازل فرمایا ہے۔ جو لوگوں کے لئے زیادہ نفع ... ہے۔

(2) والنسخ الی بدل اخف:۔ اس کی مثال ارشادِ باری ہے ﴿ احل لکم لیلة الرفث الیٰ نسآئکم ﴾ سورۃ البقرۃ آیۃ :187 یہ آیۃ سورۃ البقرۃ کی آیۃ :183 کی ناسخ ہے۔ ﴿ کما کتب علی الذین من قبلکم ﴾ پہلی امتوں پر روزوں کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت (مجامعت) حرام تھی۔ امتِ مسلمہ پر اس میں تخفیف کر دی گئی ہے۔

(3) النسخ الی بدل مماثل: اس کی مثال بیت المقدس سے رخ ہٹا کر کعبۃ اللہ کی طرف رخ پھیر دینا ہے۔

(4) النسخ الی بدل اثقل۔ اس کی مثال سورۃ النسآء کی آیۃ :15 ہے۔ جس میں زانی عورتوں پر چار گواہ پیش ہونے پر گھروں میں قید رکھنے کا حکم ہے۔ پھر اس سے سورۃ النور کی آیۃ :2 میں بھاری سزا مقرر کی گئی۔ کنوارے مرد، زن کو سو سو کوڑے مارنا۔ اور شادی شدہ مرد و عورت کو رجم کرنا۔ گھروں میں قید رہنا ہلکی سزا تھی پھر اس کو منسوخ کر کے اثقل (زیادہ بھاری) سزا مقرر کر دی گئی۔

(شبہ النسخ)

ناسخ منسوخ کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مگر اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

(أ) ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں کچھ امور میں نسخ کا شبہ ہوا تو انہوں نے ایسے امر کو بھی نسخ میں داخل کر دیا۔ جو نسخ میں داخل نہیں تھا۔

(ب) ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو نسخ کے بارے میں صریح و صحیح نقل پر اعتماد کرتے ہیں۔ اکثر علماء کے

نزدیک اشتباہ کا پیدا ہونا کچھ امور کی بناء پر ہے۔

ان میں سے اہم امور درج ذیل ہیں۔

(1) نسخ میں تخصیص کا اعتبار کرنا۔(اس کے لئے عام خاص کی مبحث کو دیکھئے)

(2) نسخ میں وضاحت کا اعتبار کرنا۔(اس کے لئے آنے والی مبحث المطلق والمقید کو دیکھئے)

(3) کسی سبب کا اعتبار کرنا۔ پھر منسوخ سے اس سبب کا زائل ہو جانا۔ جیسے آغازِ دعوت میں قلت اور ضعف کی وجہ سے کفار کی ایذاء رسانی پر صبر و تحمل کی ترغیب دی گئی تھی۔ جب یہ سبب (قلت وضعف) دور ہو گیا اور قوت و کثرت حاصل ہو گئی تو عقیدے کے دفاع کے لئے قتال واجب ہو گیا۔

(4) امورِ جاہلیت کو شریعت اسلامیہ نے منسوخ کر دیا۔ یا پہلی امتوں کی شریعتوں کو منسوخ کیا گیا۔ جیسے بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا گیا۔ پہلی امتوں میں یہ تحدید نہیں تھی۔ اور سوائے بنی اسرائیل کے قصاص و دیت کے مسائل پہلی امتوں میں نہیں تھے۔ جیسے ابن عباسؓ کی روایت ہے۔(البخاری)

(نسخ کی مثالیں)

امام سیوطی رحمہ اللہ نے ،الاتقان، میں اکیس آیات کو نسخ کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ہم کچھ آیات کا ذکر کر کے ان کی شرح کرتے ہیں۔

(1) قولہ تعالیٰ ﴿ وللہ المشرق والمغرب فأینما تولوا فثم وجه الله . 115البقرۃ ﴾ یہ آیت البقرۃ کی آیت:144 سے منسوخ ہے:﴿ فولّ وجھک شطر المسجد الحرام ﴾ بخاری مسلم میں پہلی آیت کا حکم نفلی اور سفری نماز میں باقی ہے۔ دوسری آیت کا حکم پانچ فرض نمازوں کے لئے ہے۔

(2) قولہ تعالیٰ:﴿ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت إن ترک خیرا ن الوصیّة للوالدین والاقربین . 180البقرۃ ﴾ اسے آیۃ المواریث سے منسوخ کر دیا گیا۔

(3) قولہ تعالیٰ:﴿ یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیه قل قتال فیه کبیر .217البقرۃ ﴾ اسے سورۃ توبہ کی آیت:36 سے منسوخ کر دیا گیا۔﴿ وقاتلوا المشرکین کافة کما یقاتلونکم کافة ﴾ مشرکین سے سب مل کر قتال کرو جس طرح وہ تم سے سب مل کر جہاد کرتے ہیں۔ یعنی شہرِ حرام میں تم قتال نہ کرو۔ البتہ اگر کفار و مشرکین اس میں تمہارے

خلاف قتال کرتے ہیں تو تم بھی ان کے خلاف قتال کرو۔

(4)﴿ ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین . 65. الانفال ﴾ پھر سورۃ الانفال ہی کی آیۃ:66 سے تخفیف کردی گئی۔ ﴿ الآن خفف اللہ عنکم وعلم ا ن فیکم ضعفا فان یکن ماۃ صابرۃ یغلبوا مائتین : ﴾ پہلے ایک مومن کو دس مشرکین کے خلاف لڑنے کا حکم تھا۔ پھر مومنین میں کمزوری کی بناء پر تخفیف کردی گئی کہ اگر کفار تم سوسے دگنے ہوں تو تمہیں ٹکرا جانا چاہیے۔

(5) قولہ:﴿ انفروا خفافاً وثقالاً . 41۔توبۃ ﴾ (جہاد کے لئے) نکلو ہلکے سب، ہلکے یا بوجھل یعنی مسلح یا غیر مسلح) سورۃ التوبۃ ہی آیت:122 سے تمام لوگوں کو جہاد کے لئے نکلنے سے مستثنیٰ کردیا گیا۔﴿ وما کان للمؤمنین لینفروا کافۃ ﴾ ایمانداروں کے لائق نہیں کہ سب کے سب لڑائی کے لئے نکل پڑیں۔

السؤال:۔ مطلق اور مقید پر مختصر نوٹ لکھئے

الجواب:۔ مطلق وہ حکم ہے۔ جو حقیقت پر بلا قید وشرط دلالت کرے۔ اس کے زمرے میں ایک ہی غیر معین فرد آتا ہے۔ اس کے اکثر مقامات پر لفظ نکرہ آتا ہے۔ اثبات میں جیسے، لفظ تحریر رقبۃ، میں ۔اس سے ایک غلام کی گردن آزاد کرنا لازم آتا ہے۔ وہ غلام ہو یا مؤمن (مؤمن غلام ہو تو اُسے آزاد کرنا مستحب ہے) اسی طرح ارشاد رسولؐ ہے: لا نکاح الا بولی ۔ ولی بھی جنس الاولیاء میں مطلق ہے۔ یہ قید اور شرط نہیں کہ ولی صالح ہو یا غیر صالح ہو یعنی کوئی معین ولی مراد نہیں ہے۔ المقید وہ ہے جو کسی قید شرط یا صفت کے ساتھ حقیقت پر دلالت کرے۔ جیسے ارشاد باری میں رقبۃ کو ایمان سے مقید کردیا گیا ہے۔﴿ فتحریر رقبۃ مومنۃ ﴾ اس میں ایمان کی قید کا ذکر ہے۔

مطلق اور مقید کی اقسام اور ہر ایک کا حکم

(1) سبب اور حکم دونوں متحد (یکساں) ہوں۔ جیسے قسم کے کفارہ میں روزوں کا ذکر ہے۔ اس کا ذکر قرآن کی قرآءۃ متواترہ میں مطلقاً ہے۔ ﴿ فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم 89۔المائدۃ ﴾ جو شخص (دس مساکین کو کھلانے کی طاقت نہ رکھتا ہو) وہ تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ جب تم قسم اٹھا بیٹھو اور (اسے پوری نہ کرسکو) دس مساکین کو کھانا کھلانا اور تین روزے رکھنا برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

(2) سبب تو یکساں ہو مگر مختلف ہو۔ جیسے وضوء اور تیمم میں ہاتھوں کا معاملہ ہے۔ سبب تو ایک ہے یعنی وضوء کا ٹوٹنا مگر غسل اور تیمم میں فرق ہے۔ غسل میں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا ہے۔ مگر تیمم میں ہاتھوں اور کلائی تک مسح واجب ہے۔

(3) سبب مختلف اور حکم یکساں ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ کہ تقیید ایک ہی امر پر ہو۔ جیسے کفارۂ قتل خطاء میں ایماندار گردن کا آزاد کرنا لازم ہے۔ یہ حکم سورۃ النساء کی آیۃ :92 میں ہے۔ ظہار میں اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو بیوی کو چھونے سے پہلے اگر گردن آزاد کرے۔ 3: المجادلۃ) مالکیہ اور شوافع کی اکثریت کا مذہب ہے کہ ظہار میں کافر غلام کی بجائے مومن غلام کو آزاد کرنا لازم ہے۔ احناف کا مذہب ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن میں مطلق گردن آزاد کرنے کا حکم ہے۔ اسلئے مومن گردن کا آزاد کرنا بلا دلیل کے ہے اس لئے ظہار اور یمین کے کفارہ میں کافر غلام کو بھی آزاد کیا جاسکتا ہے۔

پہلی رائے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ جب قتلِ خطاء پر مومن غلام کو آزاد کرنا واجب ہے۔ تو ظہار پر اسے محمول کیا جائے گا۔ قتل کی نص اس کو بھی شامل ہے مطلق کو مقید پر محمول کرنے کی یہ دلیل صحیح ہے۔

احناف کی رائے ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول قیاس کی بناء پر کیا جاتا ہے۔ اور قیاس سے نسخ ثابت نہیں ہوتا۔ پہلی رائے کے اصحاب اس کا یہ جواب دیتے ہیں۔ کہ ہم بھی مطلق کو مقید پر قیاس سے محمول کرنے کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہاں مطلق کو مقید کرنے کی اور وجوہ ہیں۔

ا۔ رقبۃ کا ایمان کے ساتھ مقید ہونا اس سے عموم حکم سے خارج ہونے کے لئے ایمان شرط ہے۔ جیسے قتلِ خطاء میں سبب خطاء ہے اسی طرح ظہار میں بھی خطاء ہی دخل ہے۔ اور ظہار بھی قتل سے مشابہت رکھتا ہے۔ کہ خاوند ناوانستگی سے اپنی بیوی کو منقطع اور کٹ آف کر دیتا ہے۔ یہ معاملہ بھی دو ایمانداروں (میاں بیوی) کے درمیان ہوتا ہے۔

(ب) دوسرا جواب یہ ہے کہ تقیید مختلف ہوتی ہے جیسے روزے کے ساتھ کفارہ۔ کفارے کو دو مہینے مسلسل روزے رکھنے سے مقید کیا گیا ہے۔ اسی طرح ظہار کرنے والا رجوع کرنا چاہے تو وہ بھی دو مہینے کے مسلسل رکھنے کا پابند ہے۔ یہ کفارہ کی مشابہت تقاضا کرتی ہے۔ کہ دونوں کا کفارہ بھی یکساں ہو۔ نقض یمین کا کفارہ دس مساکین کو لباس پہنانا یا کھانا کھلانا ہے۔ اگر

اس کی طاقت نہ ہو تو کفارہ تین دن کے روزے ہیں۔ ان امور میں چونکہ کفارات مختلف ہیں اس لئے مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

(4) سبب اور حکم دونوں کا مختلف ہونا۔ جیسے کہ وضوء میں غسل اور چوری میں ہاتھ کا ذکر۔ وضوء میں ہاتھ دھونے کو کہنی تک مقید کر دیا گیا ہے اور چوری میں ہاتھ کا ذکر مطلقاً ہے۔ دونوں امور کے اسباب میں اختلاف ہے۔ وضو کا سبب نقضِ وضو ہے۔ اور ہاتھ کاٹنے کا سبب مال کی چوری ہے۔ اسلئے یہاں مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب البرھان نے کہا ہے۔ اگر مطلق کو مقید کرنے کی کوئی دلیل ہے تو اسے اختیار کر لو۔ اگر کوئی دلیل نہ ہو تو اختیار نہ کرو۔ مطلق کو مطلق اور مقید کو مقید قرار دو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عربی زبان میں خطاب کیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی صفت یا شرط کے ساتھ کوئی حکم دے پھر دوسرا حکم بغیر کسی قید کے وارد ہو تو غور و فکر کیا جائے گا۔ اگر کوئی اس کی اصل اور دلیل مل جائے تو اس کی طرف اُسے لوٹا دیا جائے گا۔ اگر کوئی دلیل نہ ہو تو مقید کی تقیید واجب ہے۔

السؤال:۔ (المنطوق والمفهوم کی وضاحت کیجئے)

الجواب:۔ کبھی الفاظ کی دلالت منطوق لفظ کے ساتھ صریحاً نصاً ہوتی ہے۔ یا تقدیر کے ساتھ یا بغیر تقدیر کے احتمالاً ہوتی ہے۔ کبھی منطوق کے حکم سے موافق ہو یا مخالف ہو۔ اسی کا نام المنطوق والمفهوم ہے۔

منطوق کی تعریف اور اس کی اقسام:۔

المنطوق وہ حقیقت ہے جس پر لفظ بغیر کسی لفظ کے دلالت کرتا ہو۔ یعنی اس کی دلالت ان حروف کے مادہ ہی سے ہوتی ہو۔ جن سے وہ لفظ مرکب ہے۔ اس دلالت کی تین صورتیں ہیں۔ النص، الظاھر، المؤوّل۔

نص وہ لفظ ہے جو بنفسہٖ اپنے صریح معنٰی پر دلالت کرے۔ اس معنٰی کے سوا کسی غیر معنٰی کا اس میں احتمال نہ ہو۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ:196 ہے ﴿فصيام ثلاثة ايام في الحج وسبعة اذا رجعتم تلك عشرة كاملة﴾ اس میں عشرۃ کی صفت کاملۃ، لا کر دس سے کم روزوں کا احتمال کر دیا گیا ہے۔ لہذا یہ صریح نص ہے۔

الظاھر وہ لفظ ہے جس کے مفہوم میں مرجوح معنٰی کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ دلالت میں وہ نص کے ساتھ مشترک ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ:222 ہے۔ ﴿ولا تقربوهن حتى يطهرن

﴾ ان کے نزدیک نہ جاؤ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ انقطاع حیض کو بھی طہر کہا جاتا ہے ۔وضو اور غسل کو بھی طہر کہا جاتا ہے۔ وضوء اور غسل پر طہر کی دلالت زیادہ ظاہر ہے۔لہٰذا یہ دلالت راجحہ ہے۔اور انقطاع حیض کی طہارت مرجوحہ ہے۔ ایسے الفاظ سے ذہن مرجوح مفہوم کی طرف بھی مائل ہو سکتا ہے۔

المؤوّل:۔ وہ منطوق ہے۔ جسے کسی مانع دلیل کی وجہ سے معنٰی ءمرجوح پر محمول کیا جائے۔ کہ ایسی دلیل موجود ہے جو راجح معنٰی مراد لینے میں مانع ہے۔ جیسے سورۃ الاسراء کی آیۃ:24 ہے :﴿ واخفض لهما جناح الذل من الرحمة ﴾ اوران (والدین) کے لئے رحمت سے عاجزی کا بازو جھکا دے۔اس میں جناح الذل کا مرجوح معنٰی ہی مراد ہوگا۔اس لئے کہ جناح الذل کا راجح معنی تو عاجزی کا پر ہے۔اور انسان کے پر نہیں ہوتے بلکہ بازو ہوتے ہیں یہ دلیل راجح معنٰی مرد لینے میں مانع ہے۔اور جناح الذل کو خضوع، تواضع اور والدین کے ساتھ حُسن معاملہ پر محمول کیا جائے گا۔

(دلالۃ الاقتضاء و دلالۃ الاشارۃ)

کبھی دلالۃ اللفظ کا صحیح ہونا دلالت سے متعلق فعل پر موقوف ہوتا ہے۔ اسے دلالۃ الاقتضاء کہا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ:184 ہے:۔﴿ فمن كان منكم مريضا أو على سفر فعدة من ايام أخر ﴾ أي أفطر فعدة من ايام اخر۔ یعنی بیماری یا سفر کی وجہ سے روزہ نہ رکھے یا افطار کر دے تو باقی دنوں (یعنی جب یہ دونوں حالتیں ختم ہو جائیں) تو ان دنوں میں گنتی پوری کر لے۔اس نص میں متعلق فعل مضمر ہے۔ کبھی الفاظ کی دلالت کا صحیح ہونا اضمار فعل پر موقوف نہیں ہوتا۔ اسکی مثال سورۃ بقرۃ کی آیۃ:187 ہے۔﴿ احل لكم ليلة الصيام الرفث الىٰ نسآئكم هن لباس لكم وانتم لباس لهن علم الله انكم كنتم تختانون انفسكم فتاب عليكم وعفا عنكم فالآن باشروهن وابتغوا ما كتب الله لكم وكلوا واشربوا حتى يتبين لكم الخيط الابيض من الخيط الاسود من الفجر ﴾ یہ نص روزے کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ جو شخص ابتدائے فجر تک بیوی کے ساتھ مباشرت میں مشغول رہنے کی وجہ سے غسل نہیں کر سکتا اور جنابت کی حالت میں صبح کرتا ہے۔ اس کا روزہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ فجر تک اُسے مباشرت کی اجازت دی گئی ہے۔ اس میں کسی متعلق فعل کے اضمار کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ دونوں دلالتیں (الاقتضاء اور الاشارۃ) منطوق الفاظ سے سمجھی گئی ہیں۔ لہذا یہ دونوں بھی منطوق کی اقسام میں شامل ہیں اسی طرح منطوق کی اقسام درج ذیل ہوئیں ۔ (1) النص ۔ (2) الظاہر ۔ (3) المؤول ۔ (4) الاقتضاء ۔ (5) الاشارۃ۔

(تعریف المفہوم واقسامہ)

مفہوم وہ معنٰی ہے جس پر لفظ اپنے محلِ نطق میں دلالت نہیں کرتا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(1) مفہوم موافقۃ (2) مفہوم مخالف۔

مفہوم موافقۃ وہ ہے جس کا حکم منطوق کے حکم کی موافقت کرتا ہو۔ اسکی دو منطوق ہیں۔

(أ) پہلی قسم :۔

خطاب کی مراد۔ اور وہ اس طرح کہ مفہوم کا حکم منطوق کے حکم سے درجہ میں بلند ہو۔ جیسے اللہ تعالٰی کے اس ارشاد میں؛ اُف؛ کی کیفیت سے گالی گلوچ اور مار پیٹ کا مفہوم زیادہ مراد لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ؛ اُف؛ کے لفظ میں تو ایذا کی شدت نہیں ہے۔ ﴿فلا تقل لهما اف ۔ الاسرآء: 23﴾ اس لئے کہ منطوق الآیۃ میں تو لفظ اف کہنے کی تحریم ہے۔ اس سے سب وشتم اور مار پیٹ کی تحریم کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ مفہوم موافقت کی مثال ہے۔

(ب) دوسری قسم: لحن الخطاب ہے۔ یعنی خطاب میں مشترک معانی میں سے حکم منطوق کے مطابق معنی مراد نہ لینا۔ جیسے سورۃ النسآء کی آیۃ: 10 ہے۔ ﴿ان الذین یاکلون اموال الیتمٰی ظلما انما یاکلون فی بطونهم نارا﴾ بیشک وہ لوگ جو یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔ اس میں آگ کو کھانا لحن الخطاب ہے۔ اس لئے کہ یتیموں کا مال کھانا انکے مال کو جلانے کے مترادف ہے۔ مفہوم موافقت کی دونوں قسموں میں ادنی سے اعلیٰ پر اور اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالٰی کے اس ارشاد میں یہ دونوں جمع ہوگئے ہیں۔ جو آل عمران کی آیۃ: 75 میں ہے۔ اہل کتاب میں ایسا شخص بھی ہے۔ جسے آپ ایک خزانہ بھی امانت کے طور پر دیں تو وہ واپس کرے گا۔ ان میں ایسا شخص بھی ہے جس کے پاس آپ ایک دینار بھی امانت کے طور پر رکھیں تو واپس نہیں کرے گا۔ پہلے جملہ میں اعلیٰ سے ادنی پر تنبیہ ہے۔ کہ خزانے کی بجائے اگر اس کے پاس ایک دینار یا اس سے بھی کم امانت رکھی جائے گی تو وہ اسکو ادا کر دے گا۔ دوسرے جملہ میں اس امر سے خبردار کیا گیا ہے۔ کہ جو شخص ایک دینار بھی ادا کرنے کا روادار نہیں ہے۔ اس

کے پاس خزانہ یا دینار سے زیادہ مال بطور امانت نہ رکھو۔ یہ ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ ہے۔

(2) مفہوم المخالفۃ: وہ منطوق کے حکم کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کی بھی چند ایک انواع ہیں۔

(أ) مفہوم صفۃ: اس سے مراد معنوی صفت ہے جو منطوق کے لفظ سے مشتق ہوتی ہے۔ جیسے سورۃ الحجرات کی آیۃ: 6 میں ارشاد ربانی ہے۔ ﴿إن جآء کم فاسق بنبأ فتبینوا﴾ اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔ اس کا مخالف مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی صالح آدمی کوئی خبر لائے تو اسے تسلیم کر لیا کرو۔ اس میں خبر واحد کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے۔

(ب) مفہوم شرط:۔ مثال، سورۃ الطلاق کی آیۃ 6: ہے۔ ﴿وان کن اولات حمل فانفقوا علیهن﴾ اگر (مطلقہ عورتیں) حاملہ ہوں تو (وضع حمل تک) ان پر خرچ کرو۔ مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر وہ حاملہ نہ ہوں تو ان پر خرچ کرنا واجب نہیں ہے۔

(ج) مفہوم غایۃ: یعنی کسی حکم کے لئے انتہائی وقت کا ذکر۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیۃ: 23 ہے ﴿فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیره﴾ پھر اگر وہ اسے (اپنی بیوی کو طلاق البتہ دے کر فارغ کردے) تو اس کے لئے وہ حلال نہ ہوگی جب تک وہ اس کے غیر سے نکاح نہ کرے۔ اس میں دوبارہ نکاح کے لئے ایک مدت مقرر کر دی گئی ہے۔

(د) مفہوم حصر: جیسے سورۃ الفاتحہ کی آیۃ: 5 ہے: ﴿ایاک نعبد وایاک نستعین﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ مفہوم مخالف یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی سے مدد مانگنا حرام ہے۔

(مفہوم مخالف سے دلیل لینے میں اختلاف)

صحیح فیصلہ یہ ہے کہ ان مفاہیم مخالفت سے چند شرائط کے ساتھ دلیل لی جاسکتی ہے۔

(أ) یہ کہ مفہوم مخالف غالب کیفیت سے خارج نہ ہو۔ اس طرح سورۃ النساء کی آیت: 23 میں جو لفظ حجور ہے۔ اس کا کوئی مخالف مفہوم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ غالباً لے پالک بیٹیاں ازواج ہی کی گود میں پرورش پاتی ہیں۔

(ب) یہ کہ مذکور لفظ واقع کی وضاحت نہ کرتا ہو۔ جیسے سورۃ المومنون کی آیۃ: 117 ہے۔

﴿ومن یدع مع الله الٰه آخر لا برهان له﴾ اس میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ کسی دوسرے الٰہ کے لئے کوئی دوسری دلیل ہے ہی نہیں۔ اس کا مفہوم مخالف کوئی نہیں ہے۔ کہ کسی الٰہ پر کوئی دلیل و برہان ہو۔

دوسری مثال: ﴿ ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغآء ان اردن تحصنا ﴾ سورۃ النور آیۃ: 33 اس میں ایسا کوئی مفہوم نہیں کہ اگر

مفہوم الموافقت سے احتجاج کرنا تو بہت آسان ہے۔ ظاہریہ کے سوا تمام علماء کا اس سے دلیل لینا متفق علیہ ہے۔ رہا مفہوم المخالفت تو اس سے امام مالک، شافعی اور امام احمد بن حنبل نے احتجاج ثابت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب نے مفہوم مخالفت سے احتجاج کی نفی کی ہے۔

احتجاج ثابت کرنے والوں نے عقلی اور نقلی دلائل پیش کئے ہیں۔ ایک نقلی دلیل سورۃ التوبۃ کی آیۃ: 80 میں ارشاد ربانی ہے۔ ﴿استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم ﴾ اس سے نبیؐ نے مخالفت مفہوم ستر دفعہ سے زیادہ میں اختیار سمجھا۔

عقلی دلیل: ۔ اگر فاسق اور غیر فاسق کی تحقیق کا حکم برابر ہوتا تو فاسق کی تخصیص کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے غیر فاسق صالح اور عادل کی خبر کو تحقیق سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ یہ مفہوم مخالف کی عقلی دلیل ہے۔

(17) السؤال: ۔ اعجاز القرآن پر مختصر نوٹ لکھئے۔

الجواب: ۔ پیدائش آدم علیہ السلام سے بنی نوع انسان کی نسل ترقی اور نشوونما پاتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صحیح زندگی گزارنے کے لئے رسولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ کہ انسان از خود اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے نسل انسانی کی نشوونما کی ترقی کے ساتھ اللہ تعالیٰ انسانوں کے حسب حال شریعتیں نازل فرماتا رہا۔ سب رسولوں کا دین ایک ہی ہے۔ ہر قوم میں اللہ تعالیٰ اُسی میں سے ایک رسول مبعوث کرتا رہا۔ اور سب رسولوں کی زبانی بنیادی اعلان جو کرایا وہ یہ ہے ﴿لا الٰہ الا انا فاعبدون ﴾ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ سو میری ہی عبادت کرو۔ اس بنیادی دعوت کے علاوہ ان قوموں کے مسائل کے حل کے لئے مختلف شریعتیں نازل ہوتی رہیں اور ہر نبیؐ اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتا رہا۔ اور اس قوم میں جس امر وفن کا چرچا تھا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کے نبی کو معجزہ عطا کرتا رہا۔ مثلاً آل فرعون میں جادو کا چرچا تھا۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسی لاٹھی عطا فرمائی جس نے جادوگروں کی کمر توڑ دی۔ وہ ایمان لانے پر مجبور ہوئے۔ بنی اسرائیل میں شعبدہ بازی کا بازار گرم تھا۔ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے حکم سے ایسا طبی معجزہ عطا فرمایا کہ وہ مٹی سے

پرندے کی شکل بنا کر پھونک مارتے تھے۔تو وہ اڑ جاتا تھا باذن اللہ۔آخر رسول محمد ﷺ کی بعثت کے وقت اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بہت فخر تھا۔اللہ نے قرآنِ کریم کی صورت میں آپ کو ایسا معجزہ عطا فرمایا: کہ وہ اس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے۔قرآن کے چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے۔نیز جو کمی پہلی تمام شریعتوں میں تھی اسے آخری نبی کی شریعت سے پورا کر کے حجۃ الوداع کے موقعہ پر پسندیدہ اور آخری شریعت کے اکمال و تکمیل کا اعلان کر دیا: ﴿ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا ﴾ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا۔اور تمہیں اپنی پوری نعمت عطا کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کر لیا ہے۔اس کے بعد جو شخص کمی بیشی کرے گا اس کا اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوگا۔قیامت کے دن رسول اللہ اُس سے نفرت کرتے ہوئے (سحقا سحقا لمن غیر بعدی) کے الفاظ فرمائیں گے ۔(یعنی جس نے میرے بعد دین میں تبدیلی کر دی وہ دفع دور ہو جائے۔میرے حوضِ کوثر کے نزدیک نہ آئے۔لہذا اللہ کی آخری کتاب اسلام کا دائمی معجزہ ہے جس کا چیلنج روزِ نزول سے لے کر قیامت تک باقی ہے۔

(تعریف الاعجاز واثباتہ)

اعجاز کا لغوی معنی ہے۔عجز ثابت کرنا۔اور عجز کا مفہوم ہے کسی کام کو انجام دینے میں کوتاہی، ناکامی۔عجز قدرت کی ضد ہے۔یہاں اعجاز سے مراد نبی ﷺ کے دعویٰ رسالت میں صدق کا اظہار۔اور اہل عرب کے فصحاء و بلغاء کا آپؐ کے مقابلہ میں عجز ناکامی اور شکست کا اظہار ۔اس لحاظ سے نبیؐ پر نازل ہونے والا قرآن دائمی معجزہ ہے۔اور یہ قیامت تک قائم رہے گا۔ معجزہ ایسا امر ہوتا ہے۔جو عام انسانی عادات کے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔اور عام انسانی صلاحیت وقدرت سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔جیسے شق القمر کا معجزہ رسول اللہؐ کے ہاتھ سے ظاہر ہوا۔اور آپؐ کے انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹنا۔کنکریوں کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا۔مکہ کا ایک پتھر اور ایک درخت کا چل کر آپ کو سلام کہنا۔موسیٰ علیہ السلام کا پتھر پر لاٹھی مارنا اور اس سے بارہ چشمے پھوٹنا وغیرھا۔قرآن کریم کے ذریعے نبیؐ نے تین مراحل میں اہل عرب کو چیلنج کیا ہے۔

(أ) پہلا مرحلہ۔قرآن کے اندازِ بیان کے مقابلے کا چیلنج جو سورۃ الاسراء کی آیۃ:88 کے ذریعے

کیا گیا ہے ﴿قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا﴾ (اے نبیؐ) کہہ دیجئے! اگر (تمام) انسان اور جن جمع ہو کر اس قرآن جیسا قرآن پیش کرنا چاہیں۔ تو وہ ایسا قرآن پیش نہیں کر سکے گیں اگر چہ وہ دونوں جنسیں ایک دوسری کی (پوری) مدد کریں۔

(ب) دوسرے مرحلہ پر دس سورتیں پیش کرنیکا چیلنج کیا گیا اس کا بھی وہ سامنا نہ کر سکے۔

(ج) تیسرے مرحلہ میں ایک ہی سورت پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا۔ جو سورۃ البقرۃ کی آیۃ 23 میں درج ہے: ﴿وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ﴾ اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔ تو اس جیسی ایک ہی سورت پیش کرو۔ اس چیلنج کا بھی وہ جواب نہ دے سکے۔ حالانکہ قرآن کریم کو قریش مکہ ہی کی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ اور ان کے کلمات انہیں حروف سے مرکب ہیں۔ جنہیں وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ شعر ونثر میں تمام لغات کو استعمال کرتے تھے۔ مگر انہیں ہمت نہ ہوئی کہ قرآنی فصاحت وبلاغت کا مقابلہ کرسکیں۔ اگر کسی احمق نے چند کلمات کے ساتھ کسی سورت کا مقابلہ پیش کیا تو خود اس کے ساتھی فصحاء نے اُسے ذلیل کیا۔ مثلاً ایک احمق نے دعویٰ کیا کہ میں سورۃ الفیل جیسی آیات پیش کرسکتا ہوں۔ اور اس نے یہ چند کلمات پیش کیے: الفیل ما الفیل۔ لہ ذنب قصیر والخرطوم طویل۔ اس کے ساتھیوں ہی نے اسے ایسا ذلیل کیا کہ وہ سر نہ اٹھا سکا۔ انہوں نے کہا: سورۃ الفیل میں ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جس کا مقصد قریش کو محمدؐ کی مخالفت سے ڈرانا ہے۔ کہ اگر تم باز نہ آئے تو اصحاب الفیل کی طرح تمہیں بھی کچل دیا جائے گا۔ اصحاب الفیل کی بربادی سے تمہاری ہیبت اور تقدس میں اضافہ ہوا ہے۔ اب تم سردی گرمی کے موسم میں تجارتی سفر امن وامان کے ساتھ کرتے ہو۔ کوئی تمہاری طرف بُری نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ تُو نے ہاتھی کی شکل وصوت بیان کردی ہے۔ اس میں درسِ عبرت کیا ہے؟ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ ہاتھی کی دم چھوٹی اور سونڈ لمبی ہوتی ہے۔ وہ قرآنی فصاحت وبلاغت کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ تبھی وہ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے اسے جادو قرار دیتے تھے۔ جب کوئی شخص صحیح جواب دینے سے عاجز ہوتا ہے تو اسی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا اور اندھیرے میں لاٹھی چلاتا ہے۔ جو کبھی اس کا گھٹنا پھوڑ دیتی ہے۔ اپنی ضد اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے قرآن کو قبول نہ کیا۔ اور ستر متکبر خبیثوں نے غزوۂ بدر میں ذلت سے اپنے سر

کٹوالئے۔اور قرآن کا اعجاز بلاشک وشبہ قائم رہا۔طویل زمانہ گزرنے کے باوجود اس کا چیلنج قائم ودائم ہے۔وہ کائناتی اسرار جنہیں موجودہ سائینٹیفک علم منکشف کرتا ہے۔وہ سب کے سب قرآن کریم میں موجودہ ہیں۔موجودہ سائنس دان ان کا اعتراف کررہے ہیں۔اور انہیں رسول اللہ کی صداقت کی دلیل قرار دے رہے ہیں۔

(وجوہ اعجاز القرآن)

علماء نے دس سے زیادہ وجوہ اعجاز کا ذکر کیا ہے۔جن میں زیادہ اہم درج ذیل ہیں۔

(1) ابواسحاق ابراہیم النظام اور اس کے پیروکار المرتضی شیعہ کا مذہب ہے۔کہ اللہ تعالیٰ نے فصحاءِ عرب کی صلاحیت اور قدرت سلب کرلی تھی۔تب وہ قرآنی چیلنج کا جواب نہ دے سکے تھے۔قاضی ابوبکر باقلانی نے کہا ہے: صلاحیت سلب کرنے کا قول فاسد ہے۔اس لئے کہ سورۃ الاسراء کی آیۃ:88 میں یہ امر ثابت ہے۔کہ جن وانس میں قدرت وصلاحیت کے باوجود میں چیلنج کیا گیا ہے۔اگر ان کی صلاحیت سلب کرلی گئی ہوتو ان کا اجتماع مردوں کے اجتماع کی حیثیت رکھتا ہے۔اس اجتماع کے ذکر کا فائدہ ہی کیا ہے؟

(ب) کچھ لوگوں کا مذہب ہے قرآن اپنی فصاحت وبلاغت کے ساتھ معجز ہے۔یہی نظریہ صحیح ہے کہ قرآن اپنی فصاحت وبلاغت کے ساتھ معجز ہے یہی نظریہ صحیح اور بہتر ہے۔اہل عرب عربی لغت کے محاسن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔اسی لئے انہوں نے قرآنی چیلنج کا جواب دینے کی جرأت نہ کی۔

(ج) بعض نے کہا ہے۔کہ قرآن میں عجیب وغریب بدائع ہیں۔جو کلامِ عرب میں نہیں پائے جاتے تھے۔جیسے الفواصل اور المقاطع وغیرھما۔

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ قرآنی اعجاز مستقبل کی خبریں دینا ہے۔جو وقوع سے بہت پہلے دی گئی ہیں۔جیسے سورۃ النور کی آیت:55 ہے۔کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو صالح اعمال کی شرط پر ارضی خلافت عطا کرنے کا وعدہ کیا۔پھر اسے پورا بھی کردیا۔مگر قرآن کی سب آیات معجزہ ہیں مذکورہ بالا رائے کے لحاظ سے جن آیات میں مستقبل کی خبریں نہیں ہیں وہ اعجاز سے خارج ہوجائیں گی۔لہذا یہ رائے صحیح نہیں ہے۔

قولِ فیصل یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ اور اندازِ بیان کے ساتھ معجز ہے۔ہر حرف اپنے موضع پر معجز ہے۔اور ہر جملہ آیت میں اپنے مقام پر معجزہ ہے۔وہ اپنے بیان اور نظم وترتیب میں بھی

معجز ہے۔ وہ اپنے علوم و معارف میں اپنی شریعت میں، اور حقوق انسانی کی حفاظت میں بھی معجز ہے۔ قرآن نے عرب کے شتربانوں، چرواہوں کو سیاست دان اور قوموں کے لیڈر بنا دیا۔ حالانکہ وہ ان پڑھ تھے۔ ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کی ابجد سے بھی نا آشنا تھے۔ یہی ایک وجہ قرآن کے اعجاز کے لئے کافی ہے۔ کہ قیصر و کسریٰ کی متمدن اور مہذب حکومتیں ان کا سامنا نہ کر سکیں۔

خطابی نے اپنی کتاب، بیان اعجاز القرآن، میں کہا ہے۔ قرآن نے افصح الفاظ میں شریعت کے تمام مسائل حلال و حرام، معروف و منکر بہترین نظم و نسق کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ نافرمان قوموں کا انجام، فرمان برداروں کے انعامات کا عبرت انگیز انداز سے بیان کیا ہے۔ اس لئے تمام جن وانس اس کے مقابلہ سے عاجز آ گئے تھے۔

(القدر المعجز من القرآن)

(أ) معتزلہ کا مذہب کہ ہے کہ قرآن پورے کا پورا معجز ہے۔

(ب) بعض کا مذہب ہے کہ قرآن کا قلیل حصہ معجز ہے۔

(ج) بعض کا مذہب ہے کہ معجز حصہ ایک سورۃ کے برابر ہے اگرچہ وہ چھوٹی سی ہو۔ یا ایک آیت یا کچھ آیات کم از کم قدر معجز ہیں۔ قرآن نے پورے قرآن کی مثل لانے، دس سورتیں، پھر ایک سورت، پھر ایک حدیث (بات) پیش کرنے کا چیلنج کیا ہے۔

(الاعجاز اللغوی)

اھل عرب عربی فنون و علوم میں انتہائی بلند مقام رکھتے تھے۔ حقیقت و مجاز اپنی گفتگو میں ایجاز و اطناب سے بھی آشنا تھے۔ اس کے باوجود وہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عرب کے بڑے بڑے اساتذہ نے قرآنی فصاحت کی بلندی کا اعتراف کیا ہے۔ انسانی علوم جتنی ترقی کریں گے۔ اتنی ہی ان میں عربی زبان و قرآنی فصاحت کی سرداری کا اعتراف پایا جائے گا۔ جن لوگوں پر غرور و تکبر کا قبضہ ہے وہی اس کے اعجاز کا انکار کرتے ہیں۔ جیسے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنے والے دجالوں کا رویہ ہے۔ اگر وہ قرآنی اعجاز کا اعتراف کر لیں تو مہدویت اور نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

قرآنی اعجاز ایک بلند پہاڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے سامنے بڑے بڑوں کی گردنیں ذلت سے جھک گئی ہیں۔ انہوں نے قرآن کا انکار ضد کے ساتھ کیا۔ قرآن نے انہیں بے

وقوف اندھے بہرے اور گونگے قرار دیا ہے۔ بلکہ ڈھور ڈنگروں سے بھی زیادہ انہیں ذلیل قرار دیا ہے۔ قرآن جس نے اہل عرب کو مقابلہ سے عاجز کر دیا۔ وہ انہی کے کلام پر مشتمل تھا۔ انہی حروف سے مرکب تھا۔ مگر اس کے اسلوب، حالات کے تقاضوں سے مناسبت، تعریف وتنکیر، حذف تقدیر، ایجاز واطناب کی ایسی رنگینیاں ہیں۔ جس کا عام انسانی علوم مقابلہ نہ کر سکے۔

ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ولید ابن المغیرہ مشرک سردار نبیؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ یہ خبر ابو جہل کو پہنچی (اس نے اندیشہ کیا کہ ہمارا بوڑھا سردار قرآنی جادو سے متاثر ہو گیا ہے۔ مبادا محمدؐ پر ایمان لے آئے) ابو جہل نے آکر ولید سے کہا: اے چچا! آپ کی قوم نے ارادہ کیا ہے کہ مال جمع کر کے آپ کو دے دیں۔ آپ محمدؐ کے پاس غالباً مالی فائدے کے لئے آتے ہیں۔ ولید نے کہا: قریش جانتے ہیں کہ میں ان سے زیادہ مالدار ہوں۔ ابو جہل نے کہا: پھر اپنا قول اپنی قوم کو پہنچا دیں کہ آپ محمدؐ کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور ان کے منکر ہیں۔ ولید نے کہا: میں کیا کہوں؟ اللہ کی قسم! تم میں کوئی آدمی مجھ سے زیادہ جن وانس کے اشعار کو جاننے والا نہیں۔ مجھ سے زیادہ نہ کوئی بحرِ رجز کو جانتا ہے۔ اور نہ قصیدہ کو۔ اللہ کی قسم! جو بات محمدؐ کہتا ہے۔ وہ ان چیزوں میں سے کسی چیز سے مشابہت نہیں رکھتی۔ اللہ کی قسم! اس کے قول میں حلاوت ہے۔ اس پر طلاوت (تازگی) ہے۔ اس کی بلند ثمر آور ہے۔ اس کا اسفل (نعمتوں سے) لبریز ہے۔ اور وہ یقیناً غالب ہوگا۔ مغلوب نہیں ہوگا۔ اور یقیناً وہ اپنے دشمن کو کچل دے گا۔ ابو جہل نے کہا: اللہ کی قسم آپ کی قوم تب راضی ہوگی جب آپ اسے بُرا بھلا کہیں گے۔ ولید نے کہا: مجھے سوچنے دیجئے۔ جب ولید نے کچھ غور وفکر کیا تو کہا: یہ (قرآن) جادو ہے۔ جو شروع سے نقل ہوتا آیا ہے۔ محمدؐ کسی سے یہ نقل کر لیتا ہے۔ (بدنصیب حقیقت سمجھ کر بھی ایمان نہ لایا) جب انسان قرآن میں غور وتدبر کرے۔ تو قرآن کے اعجاز لغوی کے بہت سے اسرار اس پر منکشف ہوں گے۔ ولید کے انکاری کلمات پر اللہ نے سورۃ المدثر کی آیۃ: 11 نازل فرمائی ﴿ذرنی ومن خلقت وحیدا﴾ مجھے چھوڑ دیئے اور جسے میں نے منفرد پیدا کیا ہے۔ (وہ بہت مالدار تھا اس کے کئی طاقتور بیٹے تھے۔ جب جہنم کے انیس داروغوں کا ذکر ہوا تو اس نے کہا: سترہ کو تو میرے بیٹے چیک (Check) کر لیں گے دو کو میں خود سنبھال لونگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وارننگ دی۔

کہ میں اُسے ٹھکانے لگادوں گا۔قرآن میں تدبر کرنے والا۔اس کے الفاظ کو پائے گا کہ وہ اپنے پورے معانی ادا کرتے ہیں۔مختلف قسم کے خطابات پائے گا۔جنہیں مختلف اصناف کے انسان آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔﴿ولقد یسرنا القرآن فهل من مدكر . 17۔ القمر﴾ ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔سو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ اسی طرح جب انسان گہری نظر سے قرآن کو دیکھے گا۔تو اس کے سامنے قرآن کا چیلنج اور اعجاز لغوی قائم ہوگا۔قاضی ابوبکر باقلانی نے کہا ہے کہ کلام اللہ ان تمام اسالیب انسانی سے بلند درجہ رکھتا ہے ۔نہ یہ مقفیٰ اشعار کا مجموعہ ہے۔اور نہ مسجع کلام ہے۔انسانی طریقوں سے بالکل الگ ہے۔ اور یہ خصوصیت پورے قرآن میں پائی جاتی ہے۔کلام عرب میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔تبھی وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے۔عرب شاعروں کے کلام میں تضاد اور اختلال پایا جاتا ہے۔جبکہ قرآنِ کریم ان تمام عیوب سے پاک ہے۔اسی لئے سورۃ النسآء کی آیۃ :82 میں ارشادِ ربانی ہے﴿ ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا ﴾ اگر (یہ قرآن) غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو (لوگ) اس میں بہت اختلاف پاتے ۔قرآن میں قصص ومواعظ ، احکام ومسائلِ حیات ، اعذار وانذار ، (عذر قبول کرنا اور ڈرانا) وعدووعید ، تبشیر وتخویف (خوش کرنا اور خوفزدہ کرنا) اخلاق کریمہ ، بلند درجہ عادات ، سیر ما ثورة (سابق قوموں کی سیرت وغیرھا مختلف امور شامل ہیں ۔مگر اسقدر تصرفات کے باوجود کہیں کوئی خلل اور تضاد نہیں ہے۔ماہر شاعر اور خطیب ان تمام اصناف پر حاوی نہیں ہوتا ۔اگر اس اشعار اور خطاب میں مختلف امور کا ذکر آتا ہے۔تو اس میں خلل اور تضاد راہ پالیتا ہے۔کوئی شاعر اونٹ گھوڑوں کے وصف بیان کرتا ہے تو کوئی رات کے سفر، کوئی جنگ کا وصف، کوئی پھلواری کا وصف اور کوئی شراب کی صفات بیان کرتا ہے۔اسی طرح تمام شاعر وادیب اپنے خطابات ورسائل اور تمام اجناسِ کلام میں اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں۔مگر قرآن کے نظم وترتیب میں کہیں کوئی خلل اور اختلاف نہیں پایا جاتا۔

السؤال :۔قرآنی اعجاز کے دیگر پہلوؤں پر تبصرہ کیجیے۔

الجواب :۔قرآن کے لغوی اعجاز کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔اب علمی اعجاز کا ذکر کیا جائے گا۔اکثر لوگ جو یہ حرص رکھتے ہیں کہ قرآن میں ہر ایک نظریہ شامل ہو۔پھر اپنا ایک نظریہ طے کرکے اس کی تائید کے لئے کوئی آیت تلاش کرتے ہیں۔پھر اس کی دور از کار تاویلات کرتے اور خطاء کا

شکار ہوتے ہیں۔ اسکا سبب یہ ہے کہ تمام انسانی علوم اور فلسفوں میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ آج ایک نظریہ کے اثبات پر زور دیا جاتا ہے تو کل اس کی پُر زور تردید کی جاتی ہے۔ مگر کلام اللہ کے نظریات اٹل اور بے بدل ہیں۔ روزِ نزول سے لے کر قیامت تک کوئی تبدیلی راہ نہیں پاسکتی۔ ﴿ولن تجد لسنة الله تبديلا﴾ آپ اللہ کے طریقے (نظریے اور فیصلہ) میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔ جو لوگ تفسیر قرآن میں ایسے مسائلِ علم کی حرص رکھتے ہیں۔ جو ان کی علمی رائے سے مطابقت رکھتے ہوں۔ وہ تفسیر قرآن میں برا طریق اختیار کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ اچھا کام کررہے ہیں اس لئے کہ عام علمی مسائل میں تغیر وتبدل واقع ہوتا رہتا ہے۔ مگر قرآن ایسے علمی اعجاز کا حامل ہے کہ اگر ایک ہی علمی نظریہ پر مشتمل آیات قرآن کے مختلف مقامات پر وارد ہیں تو ان کے مرکزی خیال میں سرِ مُو بھی اختلاف اور تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ قرآن کائنات میں غور وتدبر کی دعوت دیتا ہے۔ اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کرتا۔ انسان جس قدر غور وتدبر میں بڑھتا جائے اُسے روکتا نہیں۔ سابق ادیان کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو قرآن کی طرح اس امر کی کفالت کرتی ہو۔ انسانی علوم نے بہت ترقی کی ہے۔ مگر ان میں بعض امور میں پختگی کے بعد تناقض بھی واقع ہوتا ہے۔ مگر قرآنی علوم کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں کہیں تناقض اور تخالف واقع نہیں ہوا۔ مثلاً سورۃ آل عمران کی آیات: 190، 191 میں ہے ﴿ان فی خلق السموٰت ولارض واختلاف اللیل والنھار لاٰیات لأولی الابصار: الذین یذکرون الله قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموٰت ولارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا. سبحٰنک فقنا عذاب النار﴾ بہت دور جاکر سورۂ روم کی آیۃ: 8 میں اور سورۃ الغاشیۃ کی آیات: 17، 18، 19، 20 میں یہی مضمون ہے۔ مختلف الفاظ کے باوجود مرکزی خیال میں کوئی فرق نہیں۔ سب آیات میں کائناتی اشیاء ہیں۔ غور وفکر کی دعوت ہے۔ اس طرح سورۃ البقرۃ کی آیۃ: 219، میں آیات، سورۃ الحشر کی آیۃ: 21 میں 1 مثال: سورۃ یونس کی آیۃ: 24 اور سورۃ الرعد کی آیۃ: 3 میں تدبر و تفکر اور فہم و تعقل (سمجھنے) کی دعوت دی گئی ہے۔ مذکورہ بالا آیات کے مرکزی نظریہ میں کہیں کوئی رد و بدل نہیں ہے۔ یہ قرآن کا علمی اعجاز ہے۔ جو قرآن کی علمی فضیلت کے ساتھ مسلم کا درجہ بلند کرتا ہے۔ عالم اور جاہل کو برابر قرار نہیں دیتا اور ﴿رب زدنی علما﴾ کے حکم سے علم میں زیادتی کی طلب پیدا کرتا ہے۔

(طٰہٰ:114)

اللہ تعالیٰ فلک، نباتات، طبقات الارض اور حیوانات کے علوم کو جمع کر کے ان میں غور وفکر کی ترغیب دیتا ہے۔ اور اس غور وتفکر کو اپنی خشیت کا باعث قرار دیتا ہے۔ جیسے سورۃ فاطر کی آیات: 27، 28 میں ذکر ہے۔ ﴿الم تر ان اللہ انزل من السمآء ماء فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا الوانہا ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلفا الوانہا وغرابیب سود ومن الناس والدوآب والانعام مختلفا الوانہ کذلک انما یخش اللہ من عبادہ العلماء ﴾ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کیئے اور پہاڑوں کے مختلف حصے سفید سرخ اور مختلف رنگوں کے اور انتہائی سیاہ اور لوگوں، جانوروں اور مویشیوں کو مختلف رنگوں میں پیدا کیا۔ (ان تمام چیزوں میں غور وفکر کرنے والے) اس کے علماء بندے ہی اللہ سے (صحیح طور پر) ڈرتے ہیں۔ ان دو آیات میں کئی مختلف چیزوں کو جمع کر کے ان کی پیدائش میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ نیز حصول علم کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے سے کئی دور دراز مقامات میں کائنات کی پیدائش میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیۃ: 32 اور سورۃ الانعام کی آیۃ: 97 میں تفصیل آیات، اور سورۃ الانعام کی آیۃ: 65 میں تعریف آیات کا ذکر ہے۔ تاکہ تم حقیقت توحید الٰہی کو سمجھ لو۔

قرآن میں دعوت غور وفکر کے علاوہ انسانی پیدائش کے مختلف مراحل کے ساتھ اشجار ونباتات کی تلقیح (حاملہ ہونے) کا بھی ذکر ہے۔ کہ ہوائیں نر پودوں کے بُور (پھولوں) کو مادہ پودوں کے بُور سے ملاپ کرا دیتی ہیں۔ اس میں شفاء کا بھی ذکر ہے۔ مگر یہ کتاب فلکی یا طبی نہیں ہے۔ جو لوگ اسے فلکی اور طبی علوم پر مشتمل کتاب سمجھ کر طبی امور کے استخراج پر سر پٹختے ہیں یا جو لوگ طعن کرنے کے لئے اپنے اعتراضات کی تائید تلاش کرتے ہیں۔ دونوں سلیم العقل نہیں ہیں۔ استاذ سید قطب اپنی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں کہتے ہیں: جو سورۃ البقرۃ کی آیۃ: 189 میں ہے۔ ﴿یسئلونک عن الأھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج ﴾ جواب میں انہیں عملی زندگی کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اور عملی زندگی کا وہ حصہ حج کی ادائیگی ہے۔ چاند کا محض نظری علم پیش نہیں کیا گیا کہ کس طرح وہ آسمان میں دورہ کرتا ہے۔ اور کس طرح گھٹتا بڑھتا ہے۔ اور یہ امر سوال کے مدلول (مفہوم) میں داخل

ہے۔قرآن جزئیات پر بحث کی بجائے کلیات پیش کرتا ہے۔بعض گمراہ لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی عقلی علوم قرآن کے مھیمن (محافظ) ہیں اور قرآن ان کا تابع ہے۔ یہ بالکل فاسد اور باطل خیال ہے۔ یہ قرآنی طبیعت سے بدفہمی کا نتیجہ ہے۔قرآنی علوم میں استقلال و دوام ہے۔جبکہ انسانی علوم میں استقلال وخلود نہیں بلکہ وہ ہمیشہ تکلف اور تصنع وتجدد کا ہدف رہتے ہیں۔

(الاعجاز التشریعی)

منازعات انسانی عقل پر چھا جاتے ہیں۔اگر وحی سے تعلق ہو تو عقل کو سلامتی حاصل ہوتی ہے۔اور عقل سلیم انسان کی حفاظت کرتی ہے۔وحی کی روشنی کے بغیر انسانی عقل نفسانی بے لگام خواہشات کو کنٹرول نہیں کر سکتی۔انسان طبعاً حریص ہے اور تعاون کی بجائے اپنے مفاد کیلئے دوسروں پر ظلم وزیادتی کرنے سے باز نہیں آتا۔اس لئے آسمانی شریعت کی رہنمائی اس کیلئے ضروری ہے۔قرآن نے اس بارے میں ایسی شریعت پیش کی ہے۔جو اور بے بدل ہے۔اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے گونا گوں مسائل کا اس میں حل موجود ہے۔ پہلی تمام شریعتیں اس بارے میں کامل نہیں تھیں۔

☆ بشریت نے تاریخی ادوار میں مختلف مذاہب اور نظریات کی معرفت حاصل کی ہے۔مگر وہ مذاہب کامل طور پر انسانی مشکلات کا حل پیش نہ کر سکے۔

قرآن نے عقیدۂ توحید سے مسلم کو ایسا آراستہ کیا ہے۔کہ وہ خرافات اور ظلم وزیادتی کا شکار نہیں ہوتا۔اور انسان خواہشات نفسانی کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سورۃ الاخلاص جامع ہے۔نیز سورۃ الحدید کی آیۃ:3 میں بھی اللہ کی صفات مزکور ہیں۔﴿هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شيء عليم﴾اس لئے وہی انسانی مسائل کا احاطہ کر سکتا ہے۔اور وہی ایسی شریعت پیش کر سکتا ہے۔جو قیامت تک ہر دور میں انسانی مشکلات کا حل فراہم کرے۔سورۃ الشوریٰ کی آیۃ:11 ہے﴿ليس كمثله شيء وهو السميع البصير﴾اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے۔والصلاة تنهىٰ عن الفحشآء والمنكر﴾تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی قبلہ کی طرف رخ کرتے ہیں۔مردوں پر باجماعت نماز پڑھنا فرض ہے۔سوائے کسی عذر کے۔اس طرح ایک دوسرے کی مشکلات حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔روزہ سے فاقہ کش

مساکین کا شعور حاصل ہوتا ہے۔اوران کے فقر کا مداوا ہوتا ہے۔حج سے اجتماعیت کا احساس ہوتا ہے۔اور مختلف بنی آدم کی حاضری سے انسانی مساوات کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔زکوۃ سے فقراء کی حالت سدھرتی ہے۔جہاد سے ظلم وزیادتی اور دہشت گردی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ نیز اقتصادی اور معیشت ترقی کرتی ہے۔یہ قرآن کا تشریعی اعجاز ہے۔

زکوۃ سے بخل کی جڑ کٹتی ہے۔دنیا کی حرص اور سیم وزر کی بندگی کا خاتمہ ہوتا ہے۔حج ایسی عبادت ہے جو نفس کو مشقت کا عادی بناتی ہے روزے ضبط نفس اور خواہشات نفسانی پر کنٹرول کا فائدہ دیتے ہیں۔نیز قرآن اعلیٰ فضائل کی مشق سے مسلمین کی ترتیب کرتا ہے۔ اوران میں صبر،صدق،عدل واحسان علم وعفو اور تواضع کی صفات پیدا کرتا ہے۔فرد کی تربیت کے بعد اسلام خاندان کی بنیاد ڈالتا ہے۔جس میں جنسی تقاضے کی تکمیل اور بقاء نسل کے لئے شادی کو سنت رسول قرار دیتا ہے۔پھر میاں بیوی کے حقوق وفرائض کا تقرر کرتا ہے۔

سورۃ الروم کی آیت:21 میں اپنی وحدانیت کی نشانی کا ذکر کیا ہے:﴿ومن آیاته أن خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة﴾اور اس کی نشانیوں میں سے (یہ بھی ہے) کہ اُس نے تمہی میں سے (تمہاری) بیویاں پیدا کی ہیں۔ تاکہ تم ان سے (جنسی سکوں) حاصل کرو اور تمہارے درمیان اس نے محبت اور رحمت پیدا فرمائی ہے۔مردوں کو عورتوں پر کنٹرولر قرار دیا۔پھر نظام حکومت کی بنیادیں پیش کیں۔کہ اسلامی حکومت شوری سے چلائی جائے۔اور فرد واحد (ڈکٹیٹر) کے تسلط کو ممنوع قرار دیا۔ حکومت کو ذمہ دار قرار دیا کہ وہ قرآن وسنت کے نظام کو برپا کرے۔قوم کو جہاد کے لئے تیار کرے۔سرحدوں کی حفاظت کرے۔عوام الناس کو عدل وانصاف فراہم کرے۔اور تمام فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کرے۔جو حکومت مذکورہ بالا ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتی اور فیصلے قرآن وسنت سے ہٹ کر فیصلے کرتی ہے۔ایسی حکومت اسلامی نہیں کہلاسکتی۔بلکہ اس کے لئے قرآن نے تین سخت فتووں کا اعلان کیا ہے۔سورۃ المائدۃ کی آیت:44 ہے:﴿ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکفرون﴾ جولوگ اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔اسی سورۃ کی آیت:45 ہے۔﴿ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الظالمون﴾ جولوگ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔اسی سورۃ کی آیت:47 ہے﴿ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم

الفاسقون﴾ جو لوگ اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ نافرمان (بدکردار) ہیں۔
ان آیات کی روشنی میں اسلامی حکومت کی عدالتوں میں غیر اسلامی قوانین کے ذریعے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ وہ حکومت کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ اگرچہ حکمرانوں کے نام مسلمانوں جیسے ہوں۔

(18) السوال:۔ امثال القرآن پر مختصر نوٹ لکھیے۔

الجواب:۔ اعلیٰ حقائق ایسی مثالوں کے ذریعے جو انسانی حقوق میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ ان کے بیان وو ضاحت حقائق کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت سی مثالیں بیان کر کے انسانی ذہنوں کو اپنی توحید الہیت و ربوبیت میں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ کچھ علماء نے امثال القرآن پر ہی کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان میں ابو الحسن الماوردی سے متعلق امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاتقان" میں ایک باب باندھا ہے۔ اسی طرح امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں ایسی مثالوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح مثالوں کی تعداد کچھ اوپر چالیس تک پہنچتی ہے۔ سورۃ الحشر کی آیت 21 میں ہے۔
﴿وتلک الامثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون﴾ اور ہم لوگوں کے لئے یہ مثالیں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر کریں۔
سورۃ الزمر کی آیت: 27 ﴿ولقد ضربنا للناس في هذا القرآن من كل مثل لعلهم يتذكرون﴾ اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر مثال بیان کی ہے۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قرآن کریم کو احکام، زجر و توبیخ اور واضح طور پر بیان کردہ مثالوں پر مشتمل نازل فرمایا ہے۔ (رواہ الترمذی) جس طرح علماء نے امثال القرآن پر توجہ کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے الامثال النبویۃ پر بھی خصوصی توجہ مبذول کی ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے کہا ہے۔ میں نے اہل الحدیث میں سے کسی کو نہیں دیکھا جس نے امام ترمذی کی طرح امثال پر باب باندھا ہو۔ امام ترمذی نے دروازہ کھولا پھر ایک محل یا گھر تعمیر کیا۔ مگر انہوں نے ایک چھوٹا سا منصوبہ پیش کیا ہے۔ (جس کے مقابلے میں کسی اور عالم نے ان سے بڑا باب نہیں باندھا) لہذا اس پر ان کے شکر گزار ہیں۔

(تعریف المثل)

ادب میں مثال وہ قول ہے جس میں ایسی تشبیہ بیان کی جائے۔ جس کا مخاطب کو پہلے سے علم ہو۔ اور اس کا بیان اس حالت کے مطابق ہو۔ جو مخاطب کے ذہن میں موجود ہے۔ مثال خطاء کار کے سامنے بیان کی جاتی ہے۔ اس پر غور وفکر کرے تو وہ خطاء سے بچ جاتا ہے۔ لہذا جس چیز سے تشبیہ دی جائے وہ بیان کردہ مثال سے مشابہ ہو۔ مثال کو کبھی کسی حالت اور عجیب وغریب قصے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے لفظ مثل کی تفسیر بہت سی آیات میں ہے۔ جیسے سورۃ محمد کی آیۃ: 15 میں ارشادِ باری ہے ﴿مثل الجنة التی وعد المتقون فیھا انھار من مآء غیر آسن﴾

اس جنت کی مثال جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں نہ بُسنے والے پانی کے دریا ہیں۔ یعنی جنت کی یہ صفت حیرت انگیز ہے۔ زمخشری نے اپنی کتاب، کشاف، میں ان معانی کی طرف اشارہ کیا ہے: اور کہا ہے: جب مثل کسی حالت، صفت یا عجیب الشأن قصے سے تعلق رکھتی ہے۔ تو اس کے لئے مثل کا استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کا ایک چوتھا معنیٰ ہے وہ المجاز المرکب ہے۔ جس کا مفہوم عام ہوتا ہے۔ اور اُسے ہر کوئی سمجھتا ہے۔ مثال کی اصل الاستعارۃ التمثیلیہ ہے۔ جیسے آپ کسی آدمی کو کسی کام میں متردد دیکھ کر کہیں۔ مالی اراک تقدم رجلا وتوخر اخری؟ میں تیری کیا حالت دیکھتا ہوں ایک قدم تو بڑھاتا ہے اور دوسرا قدم تو پیچھے لے جاتا ہے؟ اس میں تردد (غیر یقینی حالت) کے لئے استعارۂ تمثیلیہ بیان کیا گیا ہے۔ جب ہم امثال قرآن میں غور کرتے ہیں جنھیں مؤلفین ذکر کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمثیلی آیات کو ایک حالت سے دوسری حالت کی مثال سے مربوط کرتے ہیں تاکہ وہ عبرت حاصل کریں۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ امثال القرآن کے بارے میں فرماتے ہیں: ایک ہی حکم کے بارے میں ایک چیز کو دوسری کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ تاکہ مخاطب اس سے نصیحت حاصل کرے۔ اس میں معقول (ذہنی طور پر سمجھی ہوئی چیز) کو محسوس شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ الحجرات کی آیۃ: 12 ہے: ﴿ولا یغتب بعضکم بعضا أ یحب احدکم أن یاکل لحم اخیه میتا فکرھتموہ﴾ اور تمہارا بعض بعض کی غیبت نہ کرے۔ کیا کوئی تمہارا پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ تم (یقیناً) اسے ناپسند کرتے ہو۔ اس میں استعارہ اور تشبیہ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

(قرآنی امثال کی انواع)

ان کی تین انواع ہیں۔(1) الامثال المصرحہ۔(2) الامثال الکامنۃ۔(3) الامثال المرسلۃ۔

(1) الامثال المصرحہ وہ ہوتی ہے جن میں لفظ مثل کی صراحت کی گئی ہو۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیات 17 تا 20 میں منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے۔﴿ مثلهم كمثل الذى استوقد نارا فلما اضآءت ما حوله ذهب الله بنورهم وتركهم فى ظلمات لا يبصرون ، صم بكم عمى فهم لا يرجعون . أو كصيب من السمآء فيه ظلمت ورعد وبرق الى قوله : ان الله على كل شىء قدير ﴾ ان آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان کی ہیں۔ ایک مثال اس شخص کی جس نے آگ جلائی روشنی حاصل کرنے کے لئے جب اس آگ نے اس کا تمام ماحول روشن کر دیا اللہ نے آگ کی روشنی سلب کر لی۔ اس مثال کا مورد یہ کہ منافقین نے اسلامی دعوت کو اس لئے قبول کیا کہ اس سے انہیں مالی فوائد حاصل ہوں گے۔ اللہ نے ان کی بدنیتی کی بناء پر ان کے دلوں سے نورِ ایمان کو سلب کر لیا پھر وہ ناری (جہنمی) ہو گئے۔ دوسری مثال آسمان سے بارش نازل کرنے کی ہے۔ بارش میں اندھیرے، کڑک اور بجلی کی چمک بھی ہوتی ہے۔ بزدل منافق اپنی انگلیاں کانوں میں موت سے ڈرتے ہوئے ٹھونس لیتے ہیں۔ اس مثال کا مورد یہ ہے کہ اسلام کا زبان سے اظہار کرنے کے بعد جب آزمائشوں کے اندھیرے طاری ہوتے ہیں۔ مشکل حالات میں اوامر ونواہی پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ تو ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ بارش سے نباتات واشجار کو زندگی ملتی ہے۔ اور اسلامی روح سے مردہ دلوں کو زندگی نصیب نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ مُردہ دلی اور کفر ونفاق کے ساتھ جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ ان کی دونوں مثالوں کی یہ مناسب تشریح ہے۔

دوسری قسم امثال کامنہ ہیں۔ اور یہ وہ امثال ہیں جن میں لفظ تمثیل کی صراحت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اختصار و ایجاز کے ساتھ خوبصورت معانی پر دلالت کرتی ہیں۔ جب انہیں اپنے مشابہ معنی کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔ تو وہ فوراً دلنشیں ہو جاتی ہیں۔ جیسے عربی مقولہ ہے: خیر الامور اوسطھا: درمیانہ امر بہتر ہوتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کے لئے نہ حد سے زیادہ خرچ بہتر ہے اور نہ اتنا کم خرچ کہ ضرورت پوری نہ ہو سکے۔ بلکہ درمیانہ خرچ ہی بہتر ہوتا ہے۔ سورۃ الفرقان کی آیۃ: 67 میں ارشادِ باری ہے۔ ﴿ والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذلك قواما ﴾ اور وہ لوگ (مومنین) جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی

نہیں کرتے اور نہ تنگی اختیار کرتے ہیں۔ اور ان دونوں رویوں کے درمیان درست رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الاسرآء کی آیت: 110 اور 29 میں درمیانی راہ اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ لا یلدغ المومن من حجر مرتین: ایماندار آدمی ایک ہی سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔

تیسری قسم: امثال مرسلہ ہیں۔ یہ وہ امثال ہیں جو امثال کو شامل ہوتی ہیں۔ جن میں جملوں کو بغیر تشبیہی صراحت کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسے سورۂ یوسف کی آیت: 51 ہے: ﴿الآن حصحص الحق﴾ اب حق ظاہر ہو گیا ہے یہ عزیز مصر کی بیوی کا قول ہے۔ جس میں حق کے اظہار کی صراحت نہیں کی گئی ہے اسی طرح بہت سی آیات ہیں جن میں تمثیل وتشبیہ کی لفظا صراحت نہیں ہے۔ ایسی آیات جن میں لفظی صراحت نہیں ہے۔ انہیں امثال القرآن قرار دینا جائز نہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ اس سے مثالیں بیان کی جائیں۔ کچھ لوگوں کی رائے میں امثال بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ان سے کئی پوشیدہ اسرار کا انکشاف ہوتا ہے۔ اپنی خواہشات کی تائید کے لئے آدمی قرآن کی مثالیں پیش کرنے کو معمول بنالے۔ تو وہ قرآن کو مزاح واتھز آء بنادیگا۔

(فوائد الامثال)

(1) امثال معقول چیز کو محسوس صورت میں ظاہر کرتی ہیں۔ جیسے اللہ نے دکھاوے کے لئے خرچ کرنے کی مثال ہے۔ ﴿فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل فترکہ صلدا لا یقدرون علی شیء مما کسبوا﴾ 264 البقرۃ ﴾ اس کی مثال سخت چکنے پتھر کی سی ہے جس پر گرد پڑی ہو۔ پھر اس پر زوردار بارش نازل ہو کر اسے سخت چکنے پتھر کی مانند چھوڑ دے۔ (منافقین) اپنے اعمال کا کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکیں گے۔

(2) امثال غائب چیز کو حاضر شکل میں پیش کر دیتی ہیں۔

(3) امثال مختصر عبارت میں خوبصورت معنی جمع کر دیتی ہیں۔

(4) امثال کار خیر کی ترغیب کا فائدہ دیتی ہیں۔ جیسے اللہ نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کی مثال بیان کی ہے۔ ﴿مثل الذین ینفقون فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ ماۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشآء واللہ سمع علیم﴾ (261 سورۃ البقرۃ) ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانے کی

مانند ہے جس نے سات بالیاں پیدا کیں۔ ہر بالی میں سو (100) دانہ ہو۔ اور اللہ جس کے لئے چاہے اس سے بھی زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا اور خوب جاننے والا ہے۔ اس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی زبردست ترغیب دی گئی ہے۔

(5) مثال سے نفرت دلانے کا ثبوت: اللہ نے سورۃ الحجرات کی آیت: 12 میں غیبت سے نفرت دلائی ہے۔

(6) اللہ تعالیٰ نے مدح صحابہ میں مثل بہ کی کیفیت بیان کی ہے۔ سورۃ الفتح کی آیت: 29 صحابہ کی مثل توراۃ وانجیل میں بھی ہے۔ ایسی کھیتی کی طرح جس نے (پہلی کمزور) کونپل پیدا کی۔ پھر اسے طاقت دی۔ وہ موٹی ہوئی۔ اور اپنے تنے پر کھڑی ہوئی۔ وہ کاشکاروں کو خوش کرتی ہے۔ اور کافروں کو غصہ دلاتی ہے۔ اس کا مورد یہ ہے کہ صحابہؓ پہلے تھوڑے اور کمزور تھے۔ پھر اضافہ ہوا طاقتور ہوئے اپنی کثرت اور قوت کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور کفار انہیں دیکھ کر غیظ وغضب کا شکار ہوتے تھے۔

(7) مثال سے اللہ تعالیٰ ایسی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں جس کی کیفیت کو سب لوگ برا جانتے ہیں۔ اللہ اسے ایسی چیز سے تشبیہ دیتا ہے جس سے تمام لوگ کراہت کرتے ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیات: 174، 175 میں یہ مثال بیان کی گئی ہے۔ ﴿واتل عليهم نبأ الذى آتيناه اياتنا فانسلخ فاتبعه الشيطن فكان من الغاوين ولو شئنا لرفعناه بها ولكنه اخلد الى الارض واتبع هواه فمثله كمثل الكلب ان تحمل عليه يلهث أو تتركه يلهث ذالك مثل القوم الذين كذّبوا باياتنا﴾ اور ان کے سامنے اس شخص کی خبر پڑھئے۔ جسے ہم نے اپنی آیات کا (علم) دیا تھا۔ پھر وہ اس علم نے منحرف ہو گیا۔ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا تو وہ گمراہ ہو گیا۔

اور اگر ہم چاہتے تو (اپنی آیات کے علم وعمل سے) اسے سرفرازی عطا کرتے۔ مگر اس نے بلندی کی بجائے پستی اختیار کی۔ اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔ پھر اس کی مثال کتے کی طرح ہو گئی۔ جس پر اگر آپ کچھ بوجھ ڈال دیں تو بھی ہانپتا ہے اور اگر آپ اسے چھوڑ دیں (بوجھ نہ لادیں) تو بھی وہ ہانپتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی مثال ہے۔ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔

(8) امثال دل میں جلدی اترتی ہیں۔ نصیحت کا بہت فائدہ دیتی ہیں۔ ڈانٹنے میں پہلے قوی اور

اطمینان دلانے میں زیادہ درست ہوتی ہیں۔ سورۃ العنکبوت کی آیت: 43 ہے ﴿وتلک الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون﴾ اور ہم لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں۔ اور انہیں صاحب علم لوگ ہی سمجھتے ہیں (جاہل ان سے کچھ حاصل نہیں کرتے) نبی ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ جس سے ہر زمانے میں حق کی طرف دعوت دینے والے مدد لیتے ہیں۔ تربیت کرنے والے اس سے مدد لیتے ہیں۔ اور انہیں وضاحت اور شوق دلانے والے وسائل کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ ان سے ترغیب وتنفیر کے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے مدح وذم کرتے ہیں۔ اور وہ ضرب الامثال ہیں۔ جو قرآن کریم میں وارد ہیں۔ علماء حق اہل ادب کی طرح قرآنی امثال بیان کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ تاکہ قرآن کی خوبصورتی اور نظم ونسق کے تناسب میں فساد پیدا نہ ہو۔ ابوعبید نے کہا ہے: جو شخص اپنے کسی دوست کی مدد کے لئے کچھ دیر بعد بعد آ کر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے جو خطاب کیا تھا۔ کہ ہم نے تجھے آزمایا تھا۔ پھر تو مناسب وقت پر (کوہ طور پر) کی طرف آیا تھا۔ اس خطاب کا ذکر سورۃ طٰہٰ کی آیت: 40 میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ﴿ثم جئت على قدر يموسىٰ﴾ پھر تو مقرر وقت پر آیا ہے اے موسیٰ؟ اگر کوئی شخص اپنے کسی دوست کی مدد کے لئے آئے اور اللہ تعالیٰ کی اسی قول سے اپنے دوست کو خطاب کر دے۔ جئت کی بجائے متکلم کا صیغہ استعمال کر دے تو اس میں قرآن کے ساتھ مذاق ہے۔ اور قرآن کا استخفاف (کم رتبہ بیان کرنا) ہے۔

السؤال:۔ اقسام القرآن پر مفصل تبصرہ کیجئے۔

الجواب:۔ ہر فرد انسان کی نور حق کو قبول کرنے اور اس اطاعت کرنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ جو شخص سلیم الفطرت ہو اس کیلئے ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ العاقل تکفیہ الاشارہ، مگر جو بد فطرت ہوا سے حق کے اور زجر وتوبیخ کے تھوڑے ہی صراط مستقیم پر گامزن کرتے ہیں۔

(تقسم القسم وصيغته)

قسم کا معنی حلف اٹھانا ہے۔ اور قسم کے لئے اصل صیغہ یہ ہے کہ اُسے فعل کے ساتھ (فعل متعدی کے ساتھ متعلق کیا جائے، جس چیز کی قسم اٹھائی جائے اُسے باء تعدیہ کے ساتھ متعلق کیا جائے۔ جیسے سورۃ النحل کی آیت: 38 میں کفار کی قسم کا ذکر ہے ﴿واقسموا بالله جهد ايمانهم لا يبعث الله من يموت﴾ اور انہوں نے اللہ کے نام سے سخت قسم اٹھائی کہ جو شخص مر جائے

اُسے اللہ تعالیٰ (دوبارہ) نہیں اٹھائے گا۔ (زندہ نہیں کرے گا) لہذا صیغہ القسم کے اجزآء تین ہیں۔

(1) وہ فعل جسے باء کے ساتھ متعدی بنایا گیا ہو۔

(2) جس چیز کی قسم اٹھائی گئی تو المقسم بہ۔

(3) جس مقصد کیلئے قسم اٹھائی گئی ہو۔ یعنی المقسم علیہ۔ یا جواب قسم۔ چونکہ کلام میں بہت زیادہ قسمیں اٹھائی جاتی ہیں۔ اس لئے مختصر کرتے ہوئے فعل قسم کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اسمآء ظاہرہ میں باء کے عوض واؤ لائی جاتی ہے۔ جیسے ارشادِ باری ہے ﴿ والـلـيـل اذا يغشىٰ . 1۔ اللیل ﴾ رات کی قسم جب وہ ڈھانپ لے۔ زوردار صیغے میں واؤ کے بدل میں تاء لائی جاتی ہے: جیسے ﴿ وتالله لاكيدن اصنامكم ۔ 57۔ الانبیآء ﴾ اللہ کی قسم: اللہ کی قسم میں تمہارے بتوں کے خلاف ضرور کوئی چال چلوں گا۔ مگر تاء کا استعمال قلیل ہے اور واؤ کا استعمال کثیر ہے۔ قسم اور یمین مترادف (ہم معنی) ہیں۔ ان کے ذریعے نفس کو کسی امر سے یا روک دیا جاتا ہے یا کسی امر کی طرف اقدام کی ترغیب ہوتی ہے۔ جو امر قسم اٹھانے کے نزدیک عظیم الشان ہوتا ہے۔ حلف کا نام یمین اس لئے رکھا گیا ہے۔ کہ عرب والے آدمی اپنے ساتھی کا دایاں ہاتھ حلف اٹھاتے وقت پکڑتا تھا۔

(قرآنی قسم کا فائدہ)

مختلف اغراض کے لئے عربی زبان اندازہائے بیان کے اختلاف کی وجہ سے دوسری زبانوں سے ممتاز ہے۔ معانی کے لحاظ سے قسم کی تین اقسام ہیں۔ (1) الابتدائی۔ (2) الطلبی۔ (3) الانکاری۔ چونکہ مخاطب کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی مخاطب حکم سے خالی الذھن ہوتا ہے۔ تو اس کی غفلت دور کرنے کے لئے کلام پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس قسم کو ابتدائی کہا جاتا ہے۔ کبھی مخاطب کسی حکم کے ثبوت یا عدم ثبوت میں مقرر ہوتا ہے۔ تو تاکیدی الفاظ کے ساتھ حکم کو بہتر تقویت دی جاتی ہے۔ اس قسم کو طلبی کہا جاتا ہے۔ کبھی مخاطب حکم کا منکر ہوتا ہے۔ سو ضروری ہے کہ اس کا انکار کے مطابق قسم میں زوردار الفاظ استعمال کئے جائیں اس قسم کو انکاری کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم تمام لوگوں کیلئے نازل کیا گیا ہے۔ لوگوں کے موقف ایک دوسرے مختلف ہوتے ہیں۔ کئی تو اس حکم میں شک کرنے والے ہیں۔ کئی منکر ہوتے ہیں۔ اور کئی سخت جھگڑالو ہوتے ہیں۔ لہذا کلام اللہ میں قسم شکوک کا ازالہ کرتی،

شبہات دور کرتی، حجت قائم کرتی، اخبار میں زور پیدا کرتی اور حکم کو بہت کامل صورت میں پیش کرتی ہے۔

(المقسم بہ فی القرآن)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی ذات کے سات مقامات پر قسمیں اٹھائی ہیں۔

(1) سورۃ التغابن کی آیت:7 میں، ترجمہ۔ کفار کا دعویٰ ہے کہ انہیں (دوبارہ) زندہ نہیں کیا جائے گا اس کا نبی کی زبانی رد کیا گیا ہے۔ کیوں نہیں؟ مجھے اپنے رب کی قسم تمہیں ضرور دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

(2) سورۂ یونس کی آیت:53۔ ان تینوں آیات اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے۔ کہ وہ رب کی قسم اٹھا کر کفار کے استفسار کا جواب دیں۔

(4) سورۂ مریم کی آیت:68 میں۔ اللہ نے اپنی خود قسم اٹھا کر فرمایا ہے کہ ہم کفار اور شیاطین کو (قیامت کے دن) ضرور اکٹھا کریں گے۔

(5) سورۃ الحجر کی آیت:92 میں اللہ نے قسم اٹھا کر فرمایا ہے۔ ہم کفار و منکرین حق سے ضرور باز پُرس کریں گے۔

(6) سورۃ النساء کی آیت:65 میں اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے تنازعات میں رسول اللہ کو حکم (جج) ماننا شرط ایمان ہے۔

(7) سورۃ المعارج کی آیت:40 میں ﴿فلا اقسم برب المشارق والمغارب﴾ سورۃ الشمس کی آیت:1 تا 7 میں سورۃ اللیل کی آیات 1 تا 8۔ میں سورۃ الفجر کی آیات 1، 4 میں۔ سورۃ التکویر کی آیت: 1 تا 3 میں۔ سورۃ التین کی آیات 1، 2 میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسمیں اٹھائی ہیں۔ اپنی کمزور ترین مخلوق مچھر کی بھی قسم اٹھائی ہے۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی جلالت الشان جھلکتی ہے۔ چونکہ کفار کا اپنے معبودانِ باطلہ کے بارے میں بلند بانگ دعویٰ تھا۔ کہ وہ سب کچھ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا مچھر تو پیدا کر کے دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے جس چیز کی چاہیں قسم اٹھا سکتے ہیں۔ حسن بصری نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے جس چیز کی چاہیں قسم اٹھا سکتے مگر کسی انسان کو اللہ کے سوا کسی اور چیز کی قسم اٹھانا جائز نہیں۔ (رواہ الترمذی وحسنہ)

(انواع القسم)

(1) قسم یا ظاہر ہوتی ہے یا مضمر ہوتی ہے۔ظاہر وہ قسم ہے جس میں فعل قسم کا صراحتہ ذکر ہو اس میں مقسم بہ کی بھی صراحت ہو۔بعض قسموں میں فعل قسم حذف کر دیا جاتا ہے۔اور باء جارہ یا واو قسم پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔کبھی قسم پر لا نافیہ داخل ہوتا ہے۔اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو تمہارا گمان ہے کہ ہم تمہاری ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے یا تمہیں دوبارہ زندہ نہیں کریں گے یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔لائے نفی سے کفار کے غلط عقائد و مزعومات کی نفی کر کے پھر قسم کی ابتدا کی جاتی ہے۔قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا زائدہ ہے۔اور مذکورہ آیت میں جواب قسم محذوف ہوتا ہے۔

(2) القسم المضمر۔وہ ہے جس میں فعلِ قسم اور مقسم بہ کی صراحت نہیں ہوتی۔اس قسم پر لام تاکید ہی دلالت کرتا ہے۔جو جواب قسم پر داخل ہوتا ہے۔جیسے آل عمران کی آیت: 186 ہے: ﴿لتبلونّ فی اموالکم وانفسکم﴾ تمہیں تمہارے مالوں اور جانوں میں ضرور آزمایا جائے گا۔تبلون پر لام تاکید نے داخل ہو کر قسم کا فائدہ دیا ہے۔یعنی واللہ لتبلونّ۔

(احوال المقسم علیه)

(1) المقسم علیہ کو قسم کے ساتھ تاکید و تحقیق کے ذریعے مراد لیا جاتا ہے۔جیسے امور غائبہ اور خفیہ کو ثابت کرنے کے لئے قسم اٹھائی جاتی ہے۔

(2) جواب قسم کا کبھی ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی اُسے حذف کر دیا جاتا ہے۔جیسے لو کا جواب اکثر طور پر حذف کر دیا جاتا ہے۔مثال سورۃ التکاثر کی آیت:5 ہے۔﴿کلا لو تعلمون علم الیقین﴾ اس کا جواب محذوف ہے اس لئے کہ وہ تفخیم و تعظیم پر دلالت کرتا ہے۔تقدیر اس طرح ہوگی۔

اگر تم جان لو جو تمہارے پاس یقینی امر کا علم ہے تو تم ایسے اعمال اختیار کرو جو تمہاری آخرت کو بہتر بنادے۔لہذا یہ جواب قسم بہت عظیم الشان ہے اسلئے اسے حذف کر دیا گیا ہے۔کہ مخاطب خود اس کا اندازہ کرے گا۔کبھی جواب قسم کو حذف کر دیا جاتا ہے۔اسلئے کہ آگے جا کر اس کا اظہار ہوتا ہے۔جیسے ارشاد باری ہے ﴿لا اقسم بیوم القیمة ولا اقسم بالنفس اللوامه﴾ اس کے ساتھ ہی مذکور ہے۔﴿ایحسب الانسان ان لن نجمع عظامه﴾ یہ دونوں قسموں کا جواب ہے۔

(3) ماضی مثبت جس کے معمول کا پہلے ذکر نہ ہو۔ جب وہ قسم کے جواب کے طور پر واقع ہو تو اس پر لام اور قد کا داخل ہونا لازم ہے اور طول کلام کے وقت ہی ان دو حروف سے کسی ایک پر اکتفاء کیا جا سکتا ہے۔ جیسے سورۃ الشمس کی آیات 1 تا 8 ہیں۔ ان سب قسموں کا جواب: ﴿قد افلح من زکاھا﴾ ہے۔ لام کو طول کلام سے بچنے کیلئے حذف کر دیا گیا ہے۔ سورۃ البروج کی آیات 1 تا 4 میں کہا گیا ہے۔ کہ اس کی تینوں قسموں کو جواب کی حاجت نہیں ہے۔ ان سے تو مقسم علیھان۔ آسمان، یوم موعود، اور شاہد و مشہود سے آگاہی دی گئی ہے۔ اور یہ رب سبحانہ کی عظیم الشان آیات ہیں کہا گیا ہے کہ ان کا جواب ﴿قتل اصحاب الاخدود﴾ حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی کفار مکہ ملعون ہیں۔ جس طرح مؤمنین کو آگ میں ڈالنے والے ملعون ہیں۔ ان میں اور کفار مکہ میں قدر مشترک کمزور ایمانداروں پر ظلم و تعدی ہے۔

(4) اللہ تعالیٰ اصول ایمان پر قسم اٹھاتا ہے جن کی معرفت مخلوق پر واجب ہے۔ ان قسموں سے اپنی توحید کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ جیسے سورۃ الصافات کی آیات 1 تا 4 ہیں ﴿والصافات صفا. فالزاجرات زجرا . فالتالیات ذکرا. ان الھکم لواحد﴾ کبھی قرآن کے حق ہونے پر، کبھی رسول اللہ کے حق ہونے پر اور کبھی جزا و سزا، وعدہ وعید پر قسم اٹھاتا ہے۔ جیسے سورۃ الذاریات کی آیات: 1 تا 6 ہیں۔ ان قسموں کا جواب ہے۔ ﴿انما توعدون لصادق وان الدین لواقع﴾ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچی ہے اور جزا سزا کا دن واقع ہونے والا ہے۔ کبھی انسان کی حالت کی قسم اٹھاتا ہے۔ جیسے سورۃ اللیل کی آیات 1 تا 4 ہیں۔ ان قسموں کا جواب یہ ہے: ﴿ان سعیکم لشتّٰی﴾

(5) قسم کا جملہ غالباً خبریہ ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ الذاریات کی آیت: 23 ہے۔ ﴿فوربک لنسئلنھم اجمعین . عما کانوا یعملون﴾

(القسم والشرط)

کبھی قسم اور شرط جمع ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے پر داخل ہوتا ہے۔ اس طرح جواب ان میں سے پہلے ذکر ہونے والے کا ہوتا ہے۔ اور دوسرے کے جواب کی پروا نہیں کی جاتی۔ جیسے سورۂ مریم کی آیت: 46 ہے: ﴿لان لم تنتہ لأرجمنک﴾ اس کی تقدیر یوں ہے۔ واللہ ان لم تنتہ۔ اور شرط پر داخل ہونے والا لام جوابِ قسم کا لام نہیں

ہے۔ جیسے سورۃ الانبیاء کی آیۃ: 57 میں ہے: ﴿تالله لأكيدن اصنامكم﴾ بلکہ اکیدن پر داخل ہونے والا لام حرف شرط پر داخل ہے: یہ بتانے کے لئے کہ اس کے بعد آنے والا جواب قسم کا جواب ہے جو شرط سے پہلے مذکور ہے۔ اور اس لام کو لامِ موذِنۃ کہا جاتا ہے۔ اسے مُوطِیۃ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ لام قسم کے جواب کو لٹا دیتا ہے۔ جیسے سورۃ الحشر کی آیت: 12 ہے ﴿لئن اخرجوا لا يخرجون معهم ولئن قوتلوا لا ينصرونهم ولئن نصروهم ليولون الادبار ثم لا ينصرون﴾ اکثر طور پر اللام الموطیۃ، ان، شرطیہ پر داخل ہوتا۔ کبھی اسکے غیر پر بھی داخل ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ جملہ شرطیہ القسم المقدر کا جواب ہے۔ اسلئے کہ شرط کے لئے جواب مناسب نہیں ہوتا۔ لہذا، ارجمنک پر داخل ہونے والا لام جواب قسم کا لام ہے۔ شرط کا جواب نہیں ہے۔ بعض افعال سے قسم کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ جب قسم المقسم علیہ کی تاکید کیلئے آتی ہے تو بعض افعال قسم کا مفہوم دیتے ہیں۔ جیسے آل عمران کی آیت: 187 ہے ﴿واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتاب لتبيننه للناس﴾ لہذا لتبیننہ پر داخل ہونے والا لام لامِ قسم ہے اور اس کے بعد والا جملہ جواب قسم ہے۔ اسلئے کہ اخذ المیثاق استحلاف (قسم لینے کا) مفہوم دیتا ہے۔

السؤال:۔ جدل القرآن پر تبصرہ کیجئے۔

الجواب:۔ حقائق ظاہرہ کے ثبوت کیلئے دلیل و برھان کی حاجت نہیں ہوتی۔ مگر دشمن اکثر طور پر لوگوں کو شک پر ابھارتی ہے۔ اسے زائل کرنے کے لئے قرآنِ کریم میں جدلیات کا علم بھی ہے جس کے ذریعے عقل کے اندھے دشمنوں کو شکست دینے کیلئے قرآن نے جدلیات سے کام لیا ہے۔ قرآنِ کریم میں تمام انسانیت کیلئے حق کیطرف دعوت موجود ہے۔ جسے سلیم الفطرت بغیر کسی جھگڑے یا مناظرہ کے قبول کر لیتے ہیں اور جن لوگوں کی عقول پر جہالت کا غلبہ ہوتا ہے۔ انہیں قرآن نے جدل کے ذریعے شکست دی ہے۔

(تعریف الجدل)

جدل اور جدال سے مراد مذاکرہ میں مخالف فریق کو اسی کے تسلیم شدہ حقائق کے ذریعے مغلوب کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ ان حقائق کو وہ خود تسلیم کرتا ہے۔ جب الزاماً وہی حقائق پیش کئے جاتے ہیں تو جھگڑا کرنے والا فریق لاجواب ہو جاتا ہے۔ اس کی اصل جدلت الحبل سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنیٰ ہے میں نے رسی کو مضبوطی سے بٹ دیا۔ تاکہ وہ آسانی سے ٹوٹ نہ

سکے۔لہذا دو جھگڑنے والے فریق اپنی رائے سے ایک دوسرے کو مضبوطی سے جکڑتے ہیں۔
اللہ نے سورۃ الکہف کی آیۃ:54 انسانی فطرت کا ذکر فرمایا ہے۔﴿وکان الانسان اکثر شیء جدلا﴾ اور انسان اکثر چیزوں میں جھگڑا کرتا ہے۔(آسانی سے کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتا جب حق کے ہتھوڑے اس کے دماغ کی خبر لیتے ہیں تب کوئی چیز اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ف از مؤلف) رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے۔کہ آپ مشرکین کے ساتھ ایسے اچھے طریق سے جھگڑا کریں کہ ان کی طبیعت نرم ہو کر حق کو قبول کرلے۔سنگدلی اور اکھڑپن سے جواب دینے کو پسند نہیں کیا گیا۔سورۃ النحل کی آیت:125 میں ہے۔﴿ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن﴾ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دیجئے۔اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے جھگڑا کیجئے۔اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ساتھ مناظرہ کو جائز قرار دیا ہے۔جیسے سورۃ العنکبوت کی آیت:46 میں ذکر کیا ہے۔

﴿ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن﴾ اہل کتاب کے ساتھ احسن طریق سے ہی جھگڑا کیجئے۔

(طريقة القرآن في المناظرة)

قرآن کریم نے بہت سے دلائل و براہین کے ساتھ اپنے مخالفین سے جھگڑا کیا ہے۔جنہیں عوام وخواص واضح طور پر سمجھتے تھے۔اور ان کے تمام فاسد شبہات کو بہتر طریق سے باطل قرار دیا ہے۔اس میں عقل کو کم ہی دخل دینے کی گنجائش ہے۔قرآن نے فلاسفہ اور متکلمین کا طرز استدلال اختیار نہیں کیا۔بلکہ سادہ طریق اور قابل فہم انداز میں مخالفین کے شبہات کو دور کیا ہے۔

(أ) قرآن اہل عرب کی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔اور انہیں اس انداز سے خطاب کیا گیا ہے جسے وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

(ب) استدلال میں انسانی فطرت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔کہ انسان پیدائشی طور پر سلیم الفطرت ہے۔

(ج) دقیق اور گہرے اسرار کو خواص ہی سمجھتے ہیں۔وہاں تک رسائی عوام کے بس کی بات نہیں ہے۔اسلئے وہ بحث وجدال کے بعد ہی دعوت حق کو قبول کرتے ہیں۔اس لئے قرآن میں

بحث وجدال کے بہتر طریقے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی آیت: 164 میں کائنات کے شواہد پیش کیے ہیں۔ جنھیں عوام الناس اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے۔﴿ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السمآء من مآء فاحیا به الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الرّیاح والسحاب المسخر بین السمآء والارض لآیات لقوم یعقلون﴾ آسمان وزمین کی پیدائش، رات دن کے آنے جانے، اور وہ کشتیاں جو سمندر میں لوگوں کا نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں سے پانی نازل کیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ مردہ زمین کو زندہ کیا۔ اور اس میں ہر طرح جانور پھیلا دیے۔ ہواؤں کا ہر پھیر، اور آسمان وزمین کے درمیان مسخر بادل میں عقل مندوں کیلئے نشانیاں ہیں (تاکہ وہ غور وفکر کے بعد حق کو قبول کریں) ان مذکورہ تمام کائناتی چیزوں کو تمام اہل عرب جانتے پہچانتے تھے۔ خواہ وہ خواص ہوں یا عوام اور سادہ لوح صحرا نورد اور شتربان ہوں۔ زرکشی نے کہا ہے: جان لیجئے کہ قرآن الکریم تمام براہین ودلائل پر مشتمل ہے۔ قرآن میں ہر طرح کی کلیات معلومہ عقلیہ سمعیہ کا ذکر ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں عرب کی عادت کے مطابق وارد کیا ہے۔ متکلمین کے پیچیدہ طریقوں کی وجہ سے ان معلومات عامہ کو بیان نہیں کیا ہے۔

ایک امر یہ ہے: جیسے ارشاد باری ہے﴿وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه لیبیّن لهم ۔4: ابراہیم﴾ ہم نے ہر رسول کو اس کی قومی زبان کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ وہ ان پر واضح کردے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ اللہ نے زیادہ گہرے اور پیچیدہ الفاظ کیساتھ دلائل پیش نہیں کیے۔ ورنہ عوام وخواص ان کے فہم سے عاجز آجاتے۔ اسی لئے درج ذیل حدیث کو اس بات پر محمول کیا گیا ہے۔ کہ عوام وخواص گہرے معانی کی تلاش میں عقل کے گھوڑے نہ دوڑائیں۔ ان لکل آیة ظهرا وبطنا وحدا ومطلقا: ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ایک حد اور ایک مقام آگاہی ہوتا ہے۔ لہذا جس شخص کو علوم انسانی کا وافر حصہ مقسوم ہوتا ہے۔ وہ فہم قرآن کا بھی کافی حصہ پاتا ہے۔ اسی لئے جب اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت اور توحید الوہیت کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد کبھی غور وفکر کی اضافت عقل مندوں کیطرف کرتا ہے۔ آیات لأولی النهی۔ کبھی

سامعین کی طرف کبھی مفکرین اور کبھی متذکرین کی طرف اضافت کرتا ہے۔یعنی انسان اپنی تمام قوتوں (عقل وسمع اور تذکر) کیساتھ حقیقت کا ادراک کرسکتا ہے۔اس طریق استدلال سے انسان با آسانی سمجھ سکتا ہے۔کہ پوری نظام کائنات کا خالق ایک ہی ہے۔اگر کائنات کے صانع اور خالق دو ہوتے تو نظام کائنات میں فساد برپا ہوجاتا۔ایک اِلٰہ کا جس کام کے برپا کرنے کا ارادہ ہوتا اور دوسرے اِلٰہ کا ارادہ اس کے خلاف ہوتا تو دونوں میں جنگ برپا ہوجاتی اور نظام کائنات بگڑ جاتا۔اِس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء کی آیۃ: 22 میں ذکر کیا ہے۔﴿لوکان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا﴾ اگر زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کئی معبود ہوتے تو زمین وآسمان میں فساد برپا ہوجاتا۔

(قرآنی مناظرات کی انواع اور اس کے دلائل)

(أ) اللہ تعالیٰ نے بنیادی عقائد کیطرف انسانی توجہ مبذول کرانے کی خاطر اپنی توحید الوھیت، اپنے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور یوم آخر (قیامت) پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے۔(اگر انسان ان امور پر ایمان لائے گا تو آسانی سے اس حقیقت کو جان لے گا کہ خالق کائنات ایک ہی ہے) سورۃ البقرۃ کی آیات 163 اور 164 میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید الوھیت اور توحید ربوبیت کے ایسے دلائل پیش کیئے ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے بڑی علمی ڈگریوں کی ضرورت نہیں۔بلکہ وہ ہر انسان جو دیکھنے سننے اور غور وفکر کی قوتوں سے بہرہ ور ہے وہ بغیر کسی دقت کے سمجھ لے گا کہ کائنات کا خالق اور رب واحد ہے ﴿یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون۔الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا للہ اندادا وانتم تعلمون﴾ ان آیات میں جو کائناتی شواہد پیش کیئے گئے ہیں۔ان کے اہلِ کفر منکر نہیں تھے۔مگر اپنی ضد، سرکشی اور تکبر کی بناء پر وہ اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لانے سے گریزاں تھے۔وہ انسانی پیدائش، اور زمین کا ہموار فرش بنانا، آسمان سے پانی نازل کرنا پھر اس کے ذریعے رنگا رنگ پھلوں سے رزق مہیا کرنا ان سب امور کی تخلیق انکے مزعومہ معبودوں کے بس کی بات نہیں تھی بلکہ وہ تو ایک مچھر یا مکھی پیدا کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے تھے سنتے تھے نہ دیکھتے تھے بلکہ اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتے تھے۔ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلہاڑے سے اپنا بچاؤ کرلیتے۔

(ب) وہ طریقہ جس کے ذریعے مخالفین کو شکست دی گئی۔اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(1) مخاطب سے استفہام کرنا کہ بتاؤ کہ کائنات کی عظیم الشان مخلوق سورج چاند، آسمان اور کواکب کس نے بنائے ہیں؟ سورۃ القیامہ کی آیات 36 تا 40 میں استفہام کا ذکر ہے۔ ﴿أیحسب الانسان أن یترک سدی. الم یک نطفة من منی یمنی ثم کان علقة فخلق فسوی فجعل منه الزوجین الذکر والانثی . الیس ذالک بقادر علی أن یحیی الموتی ؟ ﴾

(2) ان آیات میں مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے منکرین سے چار سوال کئے گئے ہیں۔ جن کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ 1۔ بغیر باز پرس کے انسان کو چھوڑ دینا ۔ 2۔ انسانی پیدائش کے مراحل ۔ 3۔ میاں بیوی کی تخلیق ۔ 4۔ جس ذات نے بغیر کسی کی شراکت کے مذکورہ بالا تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ عدم سے وجود بخشا ہے۔ کیا وہ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے؟

(3) مخالف کے دعویٰ کو اس کا نقیض پیش کر کے باطل کرنا۔ یہود قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔ ان کے اس دعویٰ کے نقیض سے رد کیا گیا ہے۔ کہ بتاؤ موسیٰ علیہ السلام پر توارۃ کے منزل من اللہ ہونے کا تو تم اعتراف کرتے ہو۔ وہی اللہ محمد ﷺ پر قرآن نازل نہیں کر سکتا؟ پھر یہود کے بارے میں ارشاد ربانی ہے ﴿ وما قدروا اللہ حق قدرہ اذ قالوا ما أنزل اللہ علی بشر من شیء ﴾ انہوں نے اللہ کی (صحیح طور پر) قدر نہیں کی جب انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی پر کوئی چیز نازل نہیں کی

(4) بعض چیزوں کی صفات کے ساتھ تقسیم :-

اللہ نے سورۃ الانعام کی آیات 142، 143 اور 144 میں تقسیم کا ذکر فرمایا ہے ۔ ﴿ ثمانیة ازواج من الضأن اثنین ومن المعز اثنین قل ءالذکرین حرّم اما اشتملت علیه ارحام الانثیین نبئونی بعلم ان کنتم صدقین . ومن الابل اثنین ومن البقر اثنین اما اشتملت علیه ارحام الانثیین ام کنتم شهدآء اذ وصاکم اللہ بهذا فمن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا لیضل الناس بغیر علم ان اللہ لا یهدی القوم الظالمین ﴾ آٹھ جوڑے ہیں۔ بھیڑ کے نر و مادہ، اور بکریوں کے نر و مادہ (اے نبیؐ) پوچھئے ! کیا اللہ نے جوڑوں میں سے نروں کو حرام قرار دیا ہے یا جو بچے مادہ جانوروں کے ارحام میں ہیں ۔ مجھے صحیح علم کیساتھ خبر دیجئے اگر تم سچے ہو

۔اونٹوں سے بھی دونر و مادہ اور گائیوں سے دو نر و مادہ ہیں۔ (اے نبیؐ) (ان سے پوچھئے) کیا ان جوڑوں میں سے اللہ نے نروں کو حرام قرار دیا ہے یا ان کے مادہ جانوروں کو حرام قرار دیا ہے۔ یا ان بچوں کو جو ابھی مادہ جانوروں کے ارحام میں ہیں۔ (انہیں اللہ نے حرام کیا ہے؟) یا تم حاضر تھے جب اللہ نے تمہیں (اس حکم کی) وصیت کی ہے؟ اس شخص سے کون زیادہ ظالم ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے۔ بغیر علم کے۔ بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ مشرکین بعض جانوروں کو اپنی مرضی سے حرام قرار دیتے تھے۔ کہ یہ مواشی حرام ہیں۔ نہ ان کا دودھ دوہا جائے گا اور نہ ان پر سواری کی جائے گی۔

اور وہ مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ زندہ پیدا ہوا تو صرف مرد ہی اُسے کھائیں گے۔ عورتیں اس میں شریک نہیں ہوسکتیں اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو اس کے کھانے میں سب مرد و عورت شریک ہوں گے۔ کعبہ کی تولیت پہلے بنو جرھم کے پاس تھی۔ پھر ان کے بعد بنو خزاعہ کعبہ کے متولی ہوئے۔ عمرو بن لحی بنو خزاعہ کا سردار تھا۔ اس نے دینِ ابراہیم میں تبدیلی کی اور اسی نے بحیرہ، وصیلہ، سائبہ اور حام کے حرام ہونے کا حکم پیش کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الانعام مذکورہ بالا آیات میں ان کے عقیدہ ء باطلہ کی تردید کی ہے۔ کہ اللہ نے ان میں سے کسی چیز کو حرام نہیں کیا۔ تم نے اپنی طرف سے بعض مویشیوں کو حرام قرار دے کر کہتے ہو۔ کہ اللہ ہی نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔ یہ اللہ پر جھوٹا بہتان و افترا ہے۔

(5) مخالف کو اسی کے مسلمہ اصول کے ذریعے لاجواب کرنا۔ جیسے سورۃ الانعام کی آیات:

100 اور 101 میں ارشاد ربانی ہے ﴿ وجعلوا للہ شرکآء الجن وخلقھم وخرقوا لہ بنین وبنات بغیر علم سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون ، بدیع السمٰوٰت والارض انی یکون لہ ولد ولم یکن لہ صاحبۃ وخلق کل شیء وھو بکل شیء علیم ﴾ اور انہوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا۔ اور اللہ کے لئے بیٹوں اور بیٹیوں کا دعویٰ کیا۔ (بغیر کسی علم کے) اللہ تعالیٰ کے اس بیان سے پاک و برتر ہے۔ وہ بغیر کسی سابق نقشہ کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی اولاد کیسے ہو جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ حالانکہ اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ منکرین کو اعتراف تھا۔ کہ بیوی کے بغیر اولاد کا پیدا ہونا عام انسانی پریکٹس نہیں ہے

۔تو پھر وہ جہالت اور حماقت ہی سے اللہ کے لئے اولاد کا دعویٰ کرتے ہیں۔

السؤال:۔ قصص القرآن پر مختصر نوٹ لکھئے ل۔

الجواب:۔ انسان گذشتہ سچے قصوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ شوق کے ساتھ قصوں کہانیوں کو سنتا ہے۔
اس دور میں قصہ کا ادب میں بہت اہم مقام ہے۔ اور عربی زبان میں قصوں کا انداز بیان
سب سے زیادہ قوی ہے۔

(معنی القصص)

القصص کا معنی کسی نشان کے پیچھے چلنا۔ القَصَص ،مصدر ہے۔ سورۃ الکہف کی آیت: ہے ﴿ فارتدا
علیٰ آثارهما قصصا ﴾ موسیٰ علیہ السلام اور ان کا غلام اپنے قدموں کے نشانات کے پیچھے
چلتے ہوئے واپس ہوئے ۔ سورۂ یوسف آیت :
111 ہے ﴿ لقد كان فى قصصهم عبرة لأولى الالباب ﴾ ان کے بیان میں عقل
مندوں کے لئے یقیناً درسِ عبرت ہے۔ قصہ کے چار معانی ہیں۔ الأمر۔ الخبر۔ شان اور
حالت۔

قرآن کے قصوں میں (درسِ عبرت کے لئے) گذشتہ امتوں کے حالات ہیں۔ کہ فرماں
بردار کو کیا انعام ملا۔ اور نافرمان کا کیا انجام ہوا۔

(قرآنی قصوں کی انواع)

قرآنی قصوں کی تین اقسام ہیں۔ پہلی قسم:۔ انبیاء کے قصے۔ اور کس طرح انہوں نے اپنی
قوموں کو دعوت دی۔ اور ان کے معجزات جن کے ذریعے اللہ نے ان کی تائید فرمائی۔ دشمنوں
کا موقف۔ دعوت کے مراحل اور اس کا ارتقاء۔ مومنین اور مکذبین کا انجام۔ جیسے نوحؑ،
ابراہیم، موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، محمد صلی اللہ علیہم اجمعین کے قصے۔

دوسری قسم:۔ سابق قوموں کے حوادث وواقعات۔ اور ان کا ذکر جن کی نبوت ثابت نہیں۔ جیسے ان
لوگوں کا قصہ جو موت سے ڈرتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے۔
طالوت جالوت اور آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ۔ اہل کہف، ذی القرنین، قارون اور
اصحاب السبت کا قصہ، مریم، اصحاب الاخدود اور اصحاب الفیل کا قصہ وغیرھا من القصص
الاخریٰ۔

تیسری قسم:۔ جو واقعات وحوادث رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں وقوع پذیر ہوئے جیسے آل عمران میں غزوۂ

بدر، واحد سورۃ التوبۃ میں غزوۂ حنین وتبوک اور سورۃ الاحزاب میں غزوۂ خندق ہجرت،

الاسراء (معراج) وغیرھا کا ذکر۔

(قرآنی قصوں کے فوائد)

(1) اللہ کی طرف دعوت کی وضاحت اور شریعت کے بنیادی اصول کا بیان جن کے ساتھ ہر نبی کو مبعوث کیا گیا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت:25 میں اس کا ذکر ہے ﴿ وما ارسلنا ک من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون ﴾ ہم نے آپؐ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا ہے۔ اس کی طرف ہم یہی وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ لہذا میری ہی عبادت کرو۔

رسول اللہ اور امت محمدیہ کے دلوں کو مضبوط کرنا، ایمانداروں کا نصرت حق پر پختہ اعتماد پیدا کرنا۔ اپنے لشکر کی مدد کرنے کا بیان۔ باطل اور اہل باطل کی رسوائی ظاہر کرنا۔ اس کا ذکر سورۂ ھود کی آیت:120 میں ہے ﴿ نقص علیک من انباء الرسل فؤادک وجاءک فی ھذہ الحق و موعظۃ وذکریٰ للمؤمنین ﴾ ہم آپؐ پر رسولوں کی خبریں بیان کرتے ہیں۔ جس نے آپؐ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور اس کی دعوت آپؐ کے پاس حق، موعظت اور یاد دہانی پہنچی ہے۔ اور ایمانداروں کو بھی یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

(3) سابق انبیاء کی تصدیق، ان کے ذکر کو تازہ کرنا اور ان کے آثار کو دوام بخشنا۔

(4) صدیاں گزرنے کے بعد محمد ﷺ کا گزشتہ لوگوں کے حالات بیان کرنے سے صدق کو ظاہر کرنا۔ نیز آپ کی دعوت کو سچا ثابت کرنا۔

(5) اہل کتاب جن دلائل و براہین کو چھپاتے تھے انہیں دلیل کے ساتھ زجر و توبیخ کرنا انہوں نے اپنی کتابوں میں تحریف کی تھی۔ اس پر انہیں جھنجھوڑنا جیسے سورۂ آل عمران کی آیت:93 میں کتمان حق پر ان کی سرزنش کی گئی ہے۔ انہیں چیلنج کیا گیا ہے۔ کہ اپنی اصل کتاب لاؤ۔ اس میں وہ تمام حقائق موجود ہیں جن کی قرآن کریم تصدیق کرتا ہے۔ ﴿ کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین ﴾ ہر کھانا بنی اسرائیل کے حلال تھا۔ سوائے اس کے جسے یعقوب علیہ السلام نے (کسی تکلیف کی وجہ سے) اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اور

وہ بھی توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے کا امر ہے۔ (اے نبیؐ) کہہ دیجئے تورات کو لاؤ پھر اس کی تلاوت کرو۔ اگر تم سچے ہو۔ یہود نے کچھ چیزیں اپنی رائے سے حرام قرار دے دی تھیں۔ اس آیت میں ان کی سرزنش اور تردید کی گئی ہے۔

(6) اور قصے بھی ادب کا حصہ ہیں جنہیں سننے کے لئے لوگ شوق سے کان دھرتے ہیں۔ اور ان سے دل درسِ عبرت حاصل کرتا ہے۔ جیسے سورۂ یوسف کی آیت: 111 میں ذکر ہے۔ ﴿لقد کان فی قصصهم عبرة لأولي الألباب﴾ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے بیان میں) عقل مندوں کے لئے درسِ عبرت ہے۔

(قصوں کا تکرار اور اس کی حکمت)

ایک ہی قصہ کا کئی جگہ قرآن میں میں تکرار کے ساتھ ذکر ہے۔ اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ مختلف صورتوں میں اس کا بیان وارد ہے۔ کہیں اختصار اور کہیں اطناب کے ساتھ اور جو ان سے مشابہت رکھتا ہو۔ اور اس تکرار میں حکمت یہ ہے۔

(1) قرآن کی بلاغت کا اعلیٰ مراتب پر ہونا ہے۔ مختلف صورتوں میں۔ ہر مقام پر مختلف انداز بیان میں شوق سماع میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس تکرار سے انسان اکتاتا نہیں ہے۔

(2) ایک ہی مفہوم کو ایسے معجز انداز میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ کہ ان اسالیب میں سے کسی انداز بیان کی مثال پیش کرنے سے تمام بلغاءِ عرب عاجز آ گئے۔

(3) قصہ کی شان کا ایسا اہتمام کہ وہ قصہ دل میں درسِ عبرت کو جاگزیں کر دے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ مختلف اسالیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ تاکہ فرعون کسی انداز کے ساتھ عبرت حاصل کر لے۔

(4) مقصد کا اختلاف۔ حالات کے مختلف تقاضوں کے مطابق مقصد کے اختلاف کا بیان۔

(قرآنی قصہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ من گھڑت خیال نہیں ہوتا)

مصر کی یونیورسٹیوں کے ایک طالب علم محمد احمد خلف اللہ نے ڈاکٹری (پی ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا۔ الفن القصص فی القرآن۔ اس مقالہ نے 1367 ھجری میں ایک طویل جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ اس مقالے میں طالب علم نے اپنے خیالی قصوں کو داخل کیا تھا۔ جس کے خلاف یونیورسٹی کی تحقیقی کمیٹی کے ایک رکن استاذ احمد امین نے دوسرے ارکانِ کمیٹی کے اشتراک سے ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ کے خلاف مناقشہ اور تنقید پر مشتمل ایک تحریر لکھی۔ جو کالج کے شعبہ ادب کے انچارج کی طرف بھیجی گئی

جسے مجلہ ،الرسالۃ ،میں شائع اور نشر کیا گیا۔ یہ قرار داد جامعہ کے طالب علم کے رسالہ (مقالہ) کے خلاف زبردست تنقید پر مشتمل تھی۔ طالب علم نے اپنے مقالہ میں لکھا تھا کہ قرآن کے قصے لازماً سچے نہیں ہوتے۔ بلکہ جس طرح ادیب لوگوں کی توجہ کسی حادثہ کی فنی تصویر کی طرف مبذول کراتا ہے۔ ایسے ہی قرآنی قصے بھی عموماً فنی ہوتے ہیں۔ اور تاریخ ان کی تائید نہیں کرتی۔ جامعہ کی تحقیقی کمیٹی نے بالاتفاق اس کے مقالے کی بناء پر اُسے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا نہ کی۔ کہ اُس نے قرآنِ کریم پر بہت بڑا بہتان باندھا تھا۔

صحیح اور سچا مسلم قرآن کو کلام اللہ کے طور پر مانتا ہے۔ اور وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں فرضی قصے بیان کیے ہیں۔ قرآن فرضی قصوں کی بجائے علیم و حکیم کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اس میں فرضی قصوں کا دخل کیسے ہو سکتا ہے؟ جب ایک فاضل ادیب فرضی اور جھوٹے قصوں سے اجتناب کرتا ہے۔ تو کوئی عقل مند آدمی کیسے یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ اللہ ذی العزۃ والجلال کے کلام میں جھوٹ کی نسبت کا قائل ہو۔ اللہ نے اپنے رسولوں کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ یہ ذکر سورۃ فاطر کی آیت: 24 میں، اور 34 میں سورۃ النساء کی آیت: 170 میں سورۃ المائدہ کی آیت: 48 میں، سورۃ الرعد کی پہلی آیت میں، سورۃ الکہف کی آیت: 13 میں وارد ہے۔ سورۃ القصص کی آیت: 3 ﴿ نتلو علیک من نبا موسیٰ وفرعون بالحق ﴾ اللہ تعالیٰ نے تو ہر قصہ کو حق، سچا قرار دیا ہے۔ جو شخص قرآنی قصوں میں سچ کو لازم نہیں سمجھتا۔ اس کے دماغ میں خلل ہے یا اس پر شیطان غالب ہے۔

(قرآنی قصوں میں تربیت وتہذیب کا اثر)

محکم اور سچا قصہ کانوں میں سننے کا شوق و شغف پیدا کرتا ہے۔ اور وہ انسانی نفس میں آسانی کے ساتھ تاثیر کرتا ہے۔ انسان اکتاتا اور تھکتا نہیں۔ عقل سلیم اس کے کھیتوں سے پھول اور پھل چنتی ہے۔ ٹیلیفونی اور فرضی قصوں سے انسانی نفس اکتاتا ہے۔ سچے اور دلچسپ قصے کو تو بچے بھی بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ پھر اسے یاد رکھتے اور دوسروں کو شوق سے سناتے ہیں۔ تربیت کرنے والوں کو چاہیے کہ قرآنی قصوں کو تربیتِ اطفال میں وسیلہ بنائیں۔ جھوٹے اور فرضی قصوں سے بچوں کو بچائیں۔ انبیاء کی سیرت کے قصے، پہلی امتوں کے حالات، معاشروں کے بارے اللہ کی سنت کے اسباق سے مسلم بچوں کو آراستہ کریں۔ تربیت کرنے والا بچوں کے معیارِ علم کے مطابق قصے انداز میں بیان ایسا اختیار کرلے۔ جو بچوں کے معیارِ علم اور عمر سے مناسبت رکھتا ہو۔ اس ضمن میں سید قطب اور مختار، نے تربیتِ اطفال کے لئے بہت مفید اور دلچسپ قصے لکھے ہیں۔ اس دور میں سید ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ نے بھی، قصص النبیین، کے نام سے بہت اچھی تالیف کی ہے۔

السؤال:۔ ترجمۃ القرآن پر تبصرہ کیجئے۔

الجواب:۔ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے اس کو قومی زبان کے ساتھ نازل ومبعوث کیا ہے۔ تاکہ وہ لوگ نبی کی دعوت کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ قرآنِ کریم کو عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب اسے اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مگر عجمی (غیر عربی لوگوں کیلئے) قرآن کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ اسلئے علماء نے قرآنِ کریم کے کئی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب تک قرآنِ کریم کا تقریباً پچیس زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ جنہیں مختلف قومیں سمجھ کر اسلام قبول کررہی ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت: 158 میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبانی اعلان کرایا ہے۔ ﴿قل یآ ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا﴾ (اے نبیؐ) اعلان کردیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول (بنا کر) بھیجا گیا ہوں۔

(ترجمہ کا مفہوم)

ترجمہ کے دو معانی ہیں۔

پہلا مفہوم حرفی ترجمہ ہے۔ اور وہ ہے: ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنا۔ اس طرح کہ اس کی ترتیب میں کوئی فرق نہ آئے۔

دوسرا مفہوم: تفسیریہ اور معنوی ترجمہ ہے۔ جس سے معنوی پیچیدگی کا ازالہ ہوجائے۔ اس میں الفاظ کتاب کی ترتیب کا لحاظ پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ زبانوں کو اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ ہر زبان کا اندازِ بیان دوسری زبانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا عربی زبان میں جملہ فعلیہ فعل سے شروع ہوتا ہے۔ اور مرکب اضافی میں مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد میں آتا ہے۔ اردو میں فاعل پہلے اور فعل کا ذکر بعد میں ہوتا ہے۔ مضاف الیہ پہلے اور مضاف کا ذکر بعد میں ہوتا ہے۔ جیسے جملہ فعلیہ۔ زید نے سبق یاد کیا۔ اور مرکب اضافی: زید کا قلم قیمتی ہے۔ زبان عربی فصاحت وبلاغت میں بہت بلند درجہ رکھتی ہے۔ اس کے اندازہائے بیان اور لطائف المعانی بے نظیر ہیں۔ اور تمام آیاتِ قرآن معجزہ ہیں۔

(لفظی ترجمہ کی حکمتیں)

حرفی ترجمہ کی بھی عزت وحرمت اسی طرح ہے جس طرح قرآن کے حروف والفاظ کی حرمت ہے۔ مگر ترجمہ کو اللہ کا کلام نہیں کہا جاسکتا۔

(الترجمۃ المعنویہ)

ہر عربی کلام بلیغ کے کچھ اصلی معانی ہوتے ہیں۔ اور کچھ ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ اصلی معانی سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کے فہم میں الفاظ کے معانی اور مدلولات یکساں ہوتے ہیں۔ اور المعانی الثانویہ سے مراد نظم ونسقِ کلام کی وہ خاصیتیں ہیں۔ جن کے ذریعے کلام کی شان بلند

ہوتی ہے۔اور یہ معانی لفظی ترجمہ سے الگ ہوتے ہیں۔ ثانوی معانی سے قرآن نظم سے بدیع اور اعجاز کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ زمخشری اپنی کتاب، کشاف، میں کہتے ہیں۔ کلام عرب خصوصاً قرآن کریم میں ایسے لطائف المعانی ہیں جنھیں کوئی دوسری زبان ادا نہیں کر سکتی۔

(معنوی ترجمہ کی حکمتیں)

قرآن کی لفظی یا ترکیب کی بلاغت، تنکیر وتعریف، تقدیم وتاخیر، یا ذکر وحذف یہ ایسے خواص ہیں جن کا کوئی دوسری زبان مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایسی تفسیری اور معنوی شرح جس سے عوام الناس استفادہ کر سکیں۔ علماء اسلام کے نزدیک جائز ہے۔ کبھی قرآن کسی لفظ کو مجازی معنیٰ میں استعمال کرتا ہے۔ پھر مترجم اس مجازی کا مترادف لفظ استعمال کر بیٹھتا ہے۔ اس طرح ترجمہ میں اس سے خطاء سرزد ہوتی ہے۔ قرآنی اصلی الفاظ کے ترجمہ میں ایسا کوئی فساد راہ نہیں پاتا۔

(الترجمۃ التفسیریۃ)

علماء اسلام جب تفسیر قرآن انجام دیتے ہیں تو قریبی اور راجح معنیٰ کا قصد کرتے ہیں۔ تاکہ عوام وخواص کے اذہان میں شکوک وشبہات پیدا نہ ہوں۔ لہذا مفسر کہتا ہے۔ میں نے اس آیت کا مفہوم یوں سمجھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مترجم کو چاہیے کہ یوں کہے: یہ ترجمہ خاص افراد کے لئے ہے۔ اور یہ الفاظ قرآن کا صحیح ترجمہ ہے جب دعوتِ توحید وربوبیت اور احکام اسلام تمام لوگوں تک پہنچانا اسلامی فرض میں داخل ہے۔ تو عربی زبان کی تعلیم بھی مسلمان امت پر فرض ہے۔ جیسے مسلم کی حدیث ہے: طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ مسلم باب العلم) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب، العقل والنقل میں کہا ہے، اصل اصطلاح اور اپنی زبان میں غیر عرب قوموں سے خطاب کرنا مکروہ نہیں ہے۔ جب اس کی ضرورت پیش آئے۔ جیسے روم وایران اور ترکوں کو ان کی زبانوں میں دعوت پیش کی گئی تھی۔ اور نبیؐ نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا تھا۔ کہ وہ کتاب یہود کو سیکھیں پھر آپؐ کے سامنے اسے پڑھیں اور ان کا جواب لکھیں۔ تفسیری مفہوم کو پیش کرنا عجمی لوگوں کے سامنے ضروری ہے تاکہ وہ بھی اسلامی نعمت سے محروم نہ رہیں۔ اس لئے قرآنی مفہوم کو تفسیری ترجمے کے ساتھ پیش کرنا اسلام کے لیے ضروری علم کے زمرے میں آتا ہے۔

(عربی زبان کے بغیر نماز میں کسی دوسری زبان کا استعمال اس بارے میں دو مذہب ہیں۔)

ایک یہ کہ جو شخص عربی زبان کے الفاظ نہیں بول سکتا اس کے لئے مطلقاً جائز ہے۔ کہ اپنی زبان میں عربی زبان کے مترادف الفاظ ادا کرلے۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں نماز ادا کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہر عربی اور عجمی مسلم

کے لئے لازم ہے۔ کہ نماز کو عربی زبان کے ساتھ ادا کرے۔

پہلا مذہب احناف کا ہے۔ مروی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔

دوسرا مذہب جمہور ائمہ، مالکیہ، شافعیہ، اور حنابلہ کا ہے۔ یہ سب لوگ نماز میں غیر عربی الفاظ ادا کرنا صحیح نہیں سمجھتے۔ اسلئے عربی کلام معجز ہے اور اسکا ترجمہ اللہ کا کلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب کروڑوں غیر عربی لوگوں نے قرآن ایسی ضخیم کتاب کو سینوں میں محفوظ کر لیا ہے تو کیا چند الفاظ نماز کے یاد نہیں کئے جا سکتے؟ قاضی ابوبکر ابن العربی نے تفسیر قرآن میں کہا ہے۔ کہ سورۃ فصلت کی آیت: 44 ہے ﴿ ولو جعلناه قرآنا عجميا لقالوا لو لا فصلت آياته أأعجمي و عربي ؟ ﴾ یہ آیت ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو باطل کرتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے، فتح الباری، میں کہا ہے۔

اگر قاری عربی زبان میں قادر ہو سکتا ہو تو اس کے لئے غیر عربی زبان میں نماز ادا کرنا درست نہیں ہے۔ (اور ہر تندرست مسلم نماز کے الفاظ یاد کرنے پر قادر ہے)۔ اس کے ثبوت میں کروڑوں غیر عربی الفاظ کو جائز سمجھتے ہیں وہ بھی معترف ہیں۔ کہ قرآن کے ترجمہ کو قرآن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ وہ نماز میں عاجز کیلئے رخصت کے قائل ہیں مثلاً ایک ایرانی شخص 12 بجے اسلام قبول کرتا ہے۔ تو ظہر کی نماز وہ اپنی زبان میں ادا کر سکتا ہے۔ پھر اس کیلئے لازم ہے کہ نماز کے عربی الفاظ کو سیکھے۔ اس دور جدید میں اگر امت مسلمہ قرآن کے ساتھ اُسی طرح وابستگی اختیار کر لے جیسا اس نے قرونِ اولیٰ میں تمسک کیا تھا۔ تو تمام دنیائے عجم اس کی اقتداء کرنے پر مجبور ہو جائے۔ لہذا اس دور میں جہاں ترقی یافتہ قوموں کے علوم وفنون سیکھنا مفید ہے۔ قرآنی اصولوں پر عمل کر کے پہلی سی رفعت وسرفرازی بھی حاصل کر سکتی ہے۔

السؤال:۔ التفسیر والتاویل پر نوٹ لکھئے۔

الجواب:۔ قرآن ہی شریعت اسلامیہ کا پہلا مصدر ہے۔ عام آدمی اس کے الفاظ کے ظاہر ہی کو سمجھ سکتا ہے۔ ان سے جن مسائل کا استخراج ہوتا ہے۔ اُسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ان سے جن مسائل کا استخراج ہوتا ہے۔ اُسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ ذہین آدمی قرآن کے الفاظ سے بہت خفیہ اور پیچیدہ اسرار وحکمت کو منکشف کرتا ہے۔ وہ غریب (نامانوس) الفاظ کا ادراک کر لیتا ہے۔

(تفسیر وتاویل کے معانی)

تفسیر باب تفعیل سے ہے۔ یہ فسر سے مشتق ہے۔ جس کا مفہوم ہے وضاحت اور منکشف ہونا۔ اس سے معنی معقول کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے مشکل الفاظ کا مفہوم منکشف ہوتا ہے۔ سورۃ الفرقان کی آیت: 33 ہے ﴿ ولا یاتونک بمثل الا جئناک بالحق واحسن تفسیرا ﴾ ابن عباسؓ نے

احسن تفسیرا کا مفہوم بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کفار کی مثل کے مقابلہ میں مثال حق تفصیل کے ساتھ پیش کرے گا۔ ابوحیان نے تفسیر کی اصطلاحی کیفیت بیان کی ہے: یہ علم الفاظ قرآن کی کیفیت نطق سے بحث کرتا ہے۔ ان کے مدلولات، انفرادی اور مجموعی احکام کے استخراج کے طریقوں کو پیش کرتا ہے۔ علم سے مراد جنس علم ہے۔ جس میں تمام علوم وفنون شامل ہیں۔ یعنی اس علم میں مختلف قرآءت ان الفاظ کے مدلولات، لغت کا علم، علم التصریف اور علم الاعراب، حقیقت اور مجاز کا علم یہ تمام علوم علم تفسیر میں شامل ہیں۔ الفاظ کی ترکیب بھی ظاہر الفاظ کا تقاضا کرتی ہے۔ بعض پوشیدہ اسرار ظاہر پر محمول کرنے سے روکتے ہیں۔ اس وجہ سے الفاظ کو غیر ظاہر پر محمول کرنا پڑتا ہے۔ نسخ اور اسباب نزول کی معرفت بھی علم تفسیر میں شامل ہیں۔

☆ تأویل اول سے ماخوذ ہے۔ اور اس سے مراد آیت کے اصل کی طرف رجوع کرنا اصطلاحی طور پر تأویل الکلام کے دو معانی ہیں تأویل الکلام کا معنیٰ ہے۔ کہ متکلم نے کلام کی اصل وبنیاد کی طرف رجوع کیا۔ کلام کا حقیقی مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کی اصل کا ادراک کیا جائے۔ اور اس مقصود کے اظہار کی دو قسمیں ہیں۔ انشاء اور اخبار۔

☆ تأویل الامر۔ سے مراد کسی حکم کی اصل پر عمل کرنا۔ جیسے حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کان رسول اللہ ﷺ یقول فی رکوعہ وسجودہ: سبحٰنک اللّٰھم وبحمدک اللّٰھم اغفرلی۔ سورۃ النصر کی آیت :2 میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم تھا۔ آپؐ اس پر عمل کرتے تھے۔

☆ تاویل الاخبار:۔ وہ جس امر کی خبر دی گئی ہو جب وہ امر واقع ہو جائے۔ جیسے سورۃ الاعراف کی آیات 52 اور 53 ہیں۔ ﴿ ولقد جئناهم بكتاب فصلناه على علم وهدى ورحمة لقوم يؤمنون . هل ينظرون الا تأويله يوم يأتي تاويله يقول الذين نسوه من قبل جآءت رسل ربنا بالحق فهل لنا من شفعآء فيشفعوا لنآ أو نرد فنعمل غير الذى كنا نعمل ﴾ اس میں امر قیامت کے وقوع کی خبر دی گئی ہے کہ جب وہ واقع ہو جائے گی۔ تو کفار رسولوں کی بعثت کا اعتراف کریں گے۔ پھر سفارشیوں کی طلب کریں گے کہ وہ ان کی سفارش کریں۔ یا ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے پھر ہم وہ عمل نہیں کریں گے جو ہم پہلے کرتے تھے۔ (بلکہ ہم اچھے عمل کریں گے)

☆ تاویل الکلام:۔ یعنی کلام کے معنیٰ کی وضاحت: ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اپنے قول میں ذکر کیا ہے: القول فی تاویل قولہ تعالیٰ کذا وکذا۔ اس سے مراد اس ارشاد باری کی تفسیر ہوتی ہے۔ سلف کے نزدیک تاویل سے مراد تفسیر ہی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے۔ اشیاء کی تعبیرات تین اقسام پر مشتمل ہیں۔

(1) المعنیٰ (2) التفسیر (3) التاویل

☆ المعنیٰ ۔ یہ مقصود مراد ہوتا ہے۔

(2) تفسیر کا لغوی معنیٰ ہے: الفاظ کے مفہوم کا اظہار وانکشاف کرنا۔

☆ (3) التاویل: ۔ کلام کی اصل واساس کی طرف رجوع کرنا ہے۔

(الفرق بین التفسیر والتاویل)

اس بارے میں اہم آراء درج ذیل ہیں۔

(1) تفسیر وتاویل ہم معنیٰ ہیں ۔ دلیل ابن عباسؓ کے لئے رسول اللہ کا دُعا کرنا ہے۔ اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔ اس دعا میں تفقیہ وتاویل مترادف المعانی ہیں۔

(2) جب ہم کہتے ہیں ۔ کہ تاویل کلام کی اصل مراد ہوتی ہے۔ لہذا تاویل الطلب سے فعلِ مطلوب پر عمل کرنا مراد ہوتا ہے۔

☆ تاویل الخبر سے مراد جس چیز کی خبر دی گئی ہو اس کا نفس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تفسیر اور تاویل میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لئے کہ تفسیر سے کلام کی شرح اور وضاحت کیجاتی ہے۔ اس کا وجود ذہن میں ہوتا ہے۔ اور زبان سے وہ عبارت بیان کی جاتی ہے۔ جو اس ذہنی وجود پر دلالت کرتی ہے۔ رہی تاویل تو وہ نفس الامور کی معرفت عطا کرتی ہے جن کا وجود خارج میں ہوتا ہے۔ لہذا تاویل سے مراد جس چیز کی خبر دی گئی ہو۔ اس کا وقوع ہوتا ہے۔ جیسے سورہ یونس کی آیات 38،39: ہیں۔ ﴿ ام یقولون افتراہ قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین ۔ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ ﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ (نبی نے قرآن کو خود) گھڑ لیا ہے۔ (اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے کہ اس جیسی کوئی ایک سورت تو بنالاؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا جسے تم بلا سکتے ہو۔ اُسے بلالو اگر تم سچے ہو۔ بلکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ ہی نہیں ہے۔ تفسیر وہ ہوتی ہے جو کتاب اللہ میں وضاحت کیلئے واقع ہوتی ہے۔ یا صحیح سنت سے اس کی تعیین ہوتی ہے۔ تاویل وہ ہوتی ہے جسے علماء کلام اللہ سے استنباط واستخراج کے ذریعے اخذ کرتے ہیں۔ اسی لئے بعض نے کہا ہے۔ تفسیر کا تعلق روایت سے اور تاویل کا تعلق ھدایت سے ہوتا ہے۔

(4) کہا گیا ہے: تفسیر اکثر طور پر کلام کے الفاظ کی شرح ہوتی ہے اور تاویل ان الفاظ مفہوم ومعنیٰ کو ظاہر کرتی ہے۔

(تفسیر کی فضیلت)

تفسیر کا علوم شریعت میں بہت بلند درجہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا موضوع کلام اللہ تعالیٰ

ہوتا ہے۔ جو اسرار وحکمت کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے کہ تفسیر کی غرض مضبوط کڑے سے وابستگی ہے۔اور حقیقی سعادت تک پہنچاتی ہے۔ اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہر دینی اور دنیوی کمال کے لئے لازم ہے کہ وہ شریعت کے موافق ہو۔ اور اس موافقت کا دارومدار کتاب اللہ کے صحیح علم پر ہے۔

السؤال:۔ (شروط المفسر وآدابہ) پر نوٹ لکھیئے۔

الجواب:۔ پاکیزہ علمی تحقیق سچی معرفت کی بنیاد ہے۔ اسلئے مفسر میں ایسی شروط اور آداب کا پایا جانا لازم ہے جن کے بغیر تفسیر قرآن کی اجازت نہیں ہے۔ کہ ہر نتھو پھتو قرآن کی تفسیر کرتا پھرے۔ جیسے منکرین سنت عبد اللہ چکڑالوی اور ملحد غلام احمد پرویز نے قرآن کریم کی تفسیر میں خرافات بکی ہیں۔ (شروط المفسر)

علماء نے مفسر کے لیے چند شرائط کا ذکر کیا ہے۔ جن کا ہم اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

(1) صحۃ الاعتقاد۔ یعنی مفسر کو متفق علیہ عقائد کا حامل ہونا چاہئے۔ بے دین اور بد عقیدہ لوگ یہود ونصاریٰ کی ترغیب سے نصوص قرآن میں تحریف وخیانت سے کام لیتے ہیں۔ جیسے بنگلہ دیش کی ایک فاحشہ عورت نے فتویٰ دیا ہے۔ کہ قرآن نے مرد کو چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ اس سے از خود یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عورت بھی چار شوہر رکھ سکتی ہے۔ اس بے حیا کو علم نہیں ہے۔ کہ رنڈی (کنجری) ہی کے کئی شوہر ہو سکتے ہیں۔ مگر پاکدامن عورت کے ایک سے زیادہ شوہر نہیں ہو سکتے اور یہ بے ہودگی بہت بڑے فساد کا باعث ہو سکتی ہے۔

(2) خواہشات نفسانی سے مجتنب ہونا۔ اس لئے نفسانی خواہشات کا غلام اپنے غلط مسلک کی تائید ونصرت میں عصبیت سے کام لیتا ہے۔ جس طرح گمراہ فرقے قدریہ، رافضیہ، او رمعتزلہ وغیرھا اپنے مسلک کی تائید کی خاطر تفسر قرآن میں کھینچ تان کرتے ہیں۔

(3) مفسر پہلے قرآن کی قرآن ہی کے ذریعے تفسیر کرے۔ اسلئے کہ کسی مقام پر قرآن مجمل ہوتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر اس کی تفصیل ہوتی ہے۔

(4) اگر قرآن میں شرح ووضاحت نہ پائے تو احادیث صحیحہ سے کام لے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو شرح قرآن کی ذمہ داری عطا کی ہے۔ اور نبیؐ وحی کے ذریعے قرآن کی وضاحت کرتے تھے۔ جیسے سورۃ النساء کی آیت: 105 میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو وضاحت قرآن کا ذمہ داری سونپتے ہیں۔

﴿انا انزلنا الیک الکتب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ﴾ بیشک ہم نے آپؐ کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کریں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے جو بھی فیصلہ فرمایا ہے وہ قرآن کو سمجھ کر

وحی غیر متلو کی روشنی میں کیا ہے۔ اس کی مثالیں قرآن میں بہت زیادہ ہیں جنہیں اتقان، کے مولف نے اپنی کتاب میں جمع کیا ہے۔ یہ مجموعہ، اتقان، کی آخری فصل میں ہے۔

(5) جب مفسر کسی مسئلہ کا حل قرآن وسنت میں نہ پائے تو اجماع صحابہؓ کو ترجیح دے۔ اسلئے کہ صحابہؓ نزول قرآن کے وقت حاضر وشاھد تھے۔

(6) اگر مفسر قرآن وسنت اور اجماع صحابہؓ کو کسی مسئلہ کے حل کے لئے نہ پائے تو تابعین کے اقوال کی طرف رجوع کرے۔ جیسے مجاہد بن جبر، سعید ابن جبیر، موسیٰ عباسؓ، عکرمہ اور ابن عباس کے شاگرد دوسرے تابعین وغیرھم رحمھم اللہ اجمعین۔ جنہوں نے صحابہؓ سے علم شریعت سیکھا ہے۔

(7) مفسر کو عربی زبان پر خاطر خواہ عبور ہو۔ اسلئے کہ قرآن عربی زبان ہی میں نازل ہوا ہے۔

(8) ان اصول علم میں مہارت جو قرآن فہمی سے تعلق رکھتے ہیں جیسے علم القراءات، علم الصرف اور علم النحو وغیرھا۔

(9) قرآن فہمی میں باریک بینی جو مفسر کو یہ صلاحیت عطا کرتی ہے کہ وہ ایک معنیٰ کو دوسرے معنیٰ پر ترجیح دے سکے۔

(آداب المفسر)

(1) صحیح مقصد کے بارے میں حُسنِ نیت۔ فانما الاعمال بالنیات۔ (2) حسن الخلق۔ اچھی عادات کا حامل ہونا۔ (3) علم کے مطابق عمل کرنا۔ اس لئے کہ علم ان علماء ہی کا نفع بخش ہوتا ہے۔ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس لئے مفسر کو حسن سیرت کا حامل ہونا بھی لازم ہے۔

(4) نقل تفسیر میں سچائی کا ہونا۔ یہ صفت اور ادب بھی مفسر میں لازم ہے۔ نقل مسائل میں ہیرا پھیری کرنے والا مفسر خائن اور ناپسندیدہ ہے۔

(5) تواضع اور نرم خو ہونا۔ اس لئے کہ اکھڑ آدمی سے لوگ استفادہ نہیں کر سکتے۔

(6) عزۃ النفس۔ مفسر کسی صاحب جاہ وحشمت کا دباؤ قبول نہ کرے۔

(7) الجھر بالحق۔ حق ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے سے مرعوب نہ ہو۔

(8) حسن السمت۔ یعنی بہتر رویہ اور چال چلن۔ اس میں بازاری پن نہ ہو۔ اس کی سیرت باوقار ہو۔

(9) الاناۃ والرویۃ۔ گفتگو میں ٹھہراؤ۔ اور مفصل بات کرنا مفسر کا طرزِ عمل ہونا چاہئے۔

(10) تقدیم من ھو اولیٰ منہ۔ یعنی اس کے پاس جو شخص اس سے بہتر ہو۔ اسے آگے کرنا یعنی اس کی

موجودگی میں اُسی سے گفتگو کی درخواست کرنا۔

(11) حسن الاعداد وطریقہ الاداء۔ اچھی تیاری سے اپنی گفتگو کا آغاز کرے۔ پہلے نزول کا سبب بیان کرے۔ پھر مفردات کے معانی، پھر شرح تراکیب، بلاغت کی وضاحت اور اعراب کا بیان کرے۔ پھر عام معنی واضح کرے۔ پھر حیات عامہ پر اسے منطبق کرے پھر استنباط احکام کرے۔ یعنی مسائل ماخوذہ بیان کرے۔

السوال:۔ تفسیر کے آغاز اور اس کی ترقی پر بحث کیجئے۔

الجواب:۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ ہر رسول کو اس کی قومی زبان کے ساتھ مبعوث کرتا رہا ہے۔ تاکہ وہ اپنی کتاب الٰہی کی وضاحت کرے۔ چنانچہ سورۃ الشعراء کی آیات: 192، 195 میں ارشاد باری ہے۔

﴿ وانه لتنزيل رب العالمين . نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين بلسان عربي مبين ﴾

محققین کے نزدیک قرآن کے کلمات اہل عرب کے کلمات سے موافقت رکھتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے تمام فصحاء وبلغاء عرب کو قرآن جیسی ایک ہی سورت پیش کرنے کا چیلنج کیا ہے۔ قرآن میں دوسری غیر عرب اقوام کے بھی بعض الفاظ وارد ہیں۔ جیسے حبشی زبان کے الفاظ، کفلین، یعنی دو گناہ۔ ناشیۃ اللیل بمع قیام اللیل، اور مشکوٰۃ بمعنیٰ طاقچہ قرآن میں وارد ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اہل عرب دوسری زبانوں کے فاضلین سے بھی لیکر قرآن جیسی کوئی سورت پیش کر دیں۔

(عہدِ نبیؐ میں اور اصحاب نبیؐ کے عہد میں تفسیر)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو قرآن کے حفظ کی ضمانت دی ہے۔ اور آپ کو قرآن کی وضاحت کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ جیسے سورۃ النحل کی آیت: 44 میں ذکر ہے۔ ﴿ وانزلنا اليك الذكر لتبيّنه للناس ما نزّل اليهم ولعلهم يتفكرون ﴾ اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس منزل من اللہ کی وضاحت کر دیں۔ شائد وہ غور وفکر کریں۔

صحابہ بھی قرآن کو سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی زبان میں عربی تھی۔ اور مشکل مقامات کی شرح نبی علیہ السلام سے پوچھ لیتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن فہمی کے بارے میں ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ کوئی امر ایک کے ذہن سے غائب تھا تو دوسرے صحابیؓ کے ذہن میں وہ حاضر ہوتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے منبر پر پڑھا۔ ﴿ وفاكهة واباً ﴾ پھر فرمایا: فاکہۃ کو تو ہم جانتے ہیں مگر، ابا، کیا ہے؟ پھر اپنے دل کی طرف رجوع کیا اور فرمایا کہ اے عمرؓ یہ تو خواہ کا تکلف ہے۔ (الاتقان ج 2 ص 113) ابن عباسؓ کہتے ہیں میں فاطر السمٰوٰت والارض میں فاطر کا مفہوم نہیں جانتا تھا۔ اسی دوران دو بدو (جنگلی مسلم) آئے جو ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: انا فطرتھا۔ یعنی کنواں

کھودنے کی ابتداء میں نے کی تھی۔ اس بدو کی گفتگو سے میں فاطر کا مفہوم سمجھ گیا۔ کہ فاطر کا معنی ہے۔ تخلیق کی ابتداء کرنے والا۔ اہل عرب بھی قرآن کے بعض مقامات کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس بارے میں بعض صحابہ بعض پر فضیلت رکھتے تھے۔ ابن عباسؓ سب صحابہؓ سے زیادہ قرآن کو سمجھتے تھے۔

صحابہ قرآن فہمی میں تین امور پر اعتماد کرتے تھے۔ الاول۔ قرآن کو قرآن ہی کے ذریعے سمجھتے تھے۔

☆ ثانیاً۔ صحابہ کو جس آیت کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ وہ نبی ﷺ سے پوچھ لیتے تھے۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿ الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم ﴾ تو صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم میں سے کسی نے اپنے ایمان کو ظلم وزیادتی سے ملوث نہیں کیا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہیں کہ جو تم سمجھے ہو۔ کیا تم نے لقمان کے قول کو نہیں سنا؟ جس میں اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا۔

ان الشرک لظلم عظیم: (رسول اللہؐ نے ظلم کی شرح کردی کہ ظلم سے مراد کفر وشرک ہے۔ اسی طرح آپؐ نے منبر پر یہ آیت پڑھی ﴿ واعدوالھم ما استطعتم من قوۃ ﴾ پھر قوت کی شرح فرمادی۔ کہ قوت سے مراد دور مار کرنے والا اسلحہ ہے جو اس وقت تیر اندازی کی صورت میں موجود تھا۔ اس دور میں دور مار کرنے والے بہت سے ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں۔ جیسے کلاشن کوف، ڈیزی کٹر بم، اور ریوالور، پسٹل اور راکٹ وغیرھا۔ اب تیر کمان کی بجائے مسلمانوں کو جدید دور مار اسلحہ تیار کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ دشمن کے بمبار جہازوں اور راکٹوں کے مقابلہ میں تم تلوار اور تیر کمان لے کر کھڑے ہو جاؤ۔

قرآن کے بعض مقامات کی تاویل رسول اللہؐ ہی سے صادر ہوتی تھی۔ جیسے امر، ونہی، اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام فرض کئے ہیں۔ (زکوٰۃ وفطرہ وغیرھا) کی مقداریں۔ ان کی وضاحت رسول اللہؐ ہی کے ذمہ تھی۔ اسے آپؐ نے ان کلمات کے ساتھ ادا کیا۔ الا وانی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ:۔ مثلہ سے مراد وہ احکام ہیں جو وحی غیر متلو کے ذریعے آپؐ پر نازل کئے گئے تھے۔

☆ ثالثاً:۔ الفہم والاجتہاد۔ جب صحابہ کو کتاب اللہ اور سنۃ الرسولؐ میں کوئی حل نہ ملتا تھا۔ تو فہم مسائل میں اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ عربی زبان کے دقائق کو جانتے تھے۔ اور وہ قرآنی بلاغت سے بھی آشنا تھے۔ اس بارے میں صحابہؓ کی ایک جماعت مشہور ہے۔ اور وہ ہیں: چاروں خلفاء راشدین۔ ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، عبداللہ ابن عمرو العاص اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنھم اجمعین۔

فہم قرآن میں ان سب کے درمیان فرق بھی تھا۔ ان کے ساتھ روایات بھی منسوب ہیں۔ ان روایات کا درجہ بھی صحت وضعف کے لحاظ سے مختلف ہے۔

صحابہؓ سے منقول تفسیر کے بارے میں جمہور علماء کی رائے ہے کہ وہ مرفوع کا درجہ رکھتی

کی رائے داخل ہو وہ موقوف کا درجہ رکھتی ہے۔ جب تک اس کی سند رسول اللہ ﷺ تک نہ پہنچ جائے۔ صحابی کی موقوف تفسیر بھی بعض علماء کے نزدیک اختیار کرنے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ وہ اہلِ زبان تھے اور وہ نزولِ قرآن کے شاهد تھے۔ زرکشی نے "برهان" میں کہا ہے۔ کہ قرآن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کی تفسیر منقول وارد ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی رسول اللہ ﷺ سے تفسیر منقول نہیں ہے۔ پہلی قسم صحتِ سند کو دیکھا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں صحابی کے الفاظ پر غور کیا جائیگا۔ اگر اس صحابی نے لغت کے لحاظ سے تفسیر کی ہوگی اور وہ اہلِ زبان تھے، تو اس پر اعتماد کیا جائیگا۔ اس لئے کہ صحابہؓ اسبابِ نزول اور قرائین کے شاهد تھے۔ جب ہم قرآن وسنت میں تفسیر نہ پائیں تو ہم اقوال صحابہؓ کی طرف رجوع کرینگے۔ اسی طرح آئمۃ اربعہ، خلفاء راشدین اور ہدایت یافتہ دیگر آئمہ مثلاً عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ کی تفسیر کو بھی قبول کیا جائیگا۔

(ابن کثیر ج ا ص ۲)

اس زمانے میں تفسیر منظم شکل میں مدوّن نہیں تھی۔ بلکہ متفرق آیات کی منتشر تفسیرات تھیں۔ پورے قرآن کی کوئی تفسیر موجود نہیں تھی۔

التفسیر فی عصر التابعین

جس طرح بعض صحابہ تفسیرِ قرآن میں مشہور ہوئے اسی طرح بعض جلیل القدر تابعین بھی تفسیر القرآن میں مشہور ہوئے ہیں۔ ان تابعین مفسرین نے فہم قرآن کو قرآن ہی سے حاصل کیا یا ان صحابہ کے آثار و اقوال سے جنہوں نے رسولؐ اللہ سے روایت کیا ہو۔ ان تابعین کے اقوال پر مشتمل بہت سی کتابیں موجود ہیں جن میں انہوںؒ نے اپنے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ صحابہؓ نے بعض مشکل مقامات کی تفسیر رسولؐ اللہ سے پوچھ کر نقل کی ہے۔ پورے قرآن کی تفسیر صحابہؓ سے منقول نہیں ہے۔ جب لوگ عصرِ رسولؐ سے دور ہوتے گئے تو تابعین نے فہم قرآن کے لئے تفسیرِ قرآن کی تکمیل کر دی۔ جب فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ وسیع ہوا تو اکثر فاضل صحابہؓ کو مختلف مرکزی شہروں میں بھیج دیا گیا۔ ان کے شاگردوں نے ان سے علم وفہم قرآن حاصل کیا۔ پھر ان کے شاگرد تابعین سے لوگ علمی استفادہ کرتے رہے۔ انہوں نے پھر کئی مدارس قائم کئے۔ مکہ میں ابنِ عباسؓ کا مدرسہ قائم ہوا۔ مدینہ میں ان کا شاگرد تابعی سعید بن جبیر، مجاہد، ابن عباسؓ کا آزاد کردہ غلام عکرمۃ، طاؤس بن کیسان الیمانی اور عطا ابن ابی رباح مشہور ہوئے۔

یہ سب آزاد کردہ غلام تھے۔ عکرمہ کے بارے میں علماء اختلاف کرتے ہیں۔ اس کے علم وفضل کی شہادت کے باوجود اس کی توثیق میں اختلاف کرتے ہیں۔ مدینہ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ دوسروں سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان سے ان کے شاگرد تابعینؒ نے براہِ راست یا بالواسطہ علم

تفسیر حاصل کیا اور وہ ہیں زید ابن اسلم، ابو العالیہ اور محمد ابن کعب القرضی۔ عراق میں عبداللہ بن مسعودؓ کا مدرسہ قائم ہوا۔ جسے علماء اہل الرائے کا مرکزی مدرسہ قرار دیتے ہیں۔ اس مدرسہ سے ان تابعین نے شہرت حاصل کی۔ علقمہ ابن قیس، مسروق، اسود بن یزید، مرۃ الھمدانی، عامر الشعبی، حسن بصری اور قتادہ بن دعامۃ السدوی۔ یہ سب مشہور مفسرین ہیں۔ ان سے تابع تابعین نے علم تفسیر حاصل کیا۔ علماء نے ان کی تفسیر کے بارے میں توثیق نہیں کی جب انہوں نے رسول اللہؐ اور صحابہؓ سے کوئی اثر نقل نہ کیا ہو۔ کیا ان کے اقوال کو اخذ کیا جائے یا نہ اخذ کیا جائے؟ ایک جماعت کی رائے ہے۔ ''ان کی تفسیر سے دلیل اخذ نہ کی جائے۔ اس لئے کہ انہوں نے نزولِ قرآن کا اور جن حالات میں قرآن نازل ہوا ہے، ان کا مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ ان کی تفسیر سے دلیل اخذ کی جائے۔ اس لئے کہ انہوں نے بھی غالباً صحابہؓ ہی سے علم حاصل کیا تھا۔ قابلِ ترجیح یہ امر ہے کہ جس قول پر تابعین کا اجماع ثابت ہوا سے قبول کیا جائے۔ امام ابن تیمیہ اور شعبہ ابن الحجاج رحمھما اللہ نے کہا ہے کہ تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں۔ انہیں تفسیر قرآن میں کیسے حجت مان لیا جائے؟ مگر جب کسی امر پر ان کا اجماع ثابت ہو اس کے حجت ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ (مقدمہ ابن تیمیہ فی اصول التفسیر ص ۲۸، ۲۹ والاتقان ج ۲، ص ۱۷۹)

تابعین نے ان اہل کتاب سے بھی بعض امور نقل کیے ہیں جو بعد میں اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ جیسے عبداللہ بن سلام، کعب بن الاحبار، وھب بن منبہ اور عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج وغیرہم۔ ان کی عبارتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مرکزی خیال میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

تدوین کے زمانوں میں تفسیرِ قرآن

تدوینِ تفسیر کا آغاز عہدِ بنی اُمیہ کے آخر اور عہدِ بنی عباسؓ کی ابتدا میں ہوا ہے۔ حدیثِ نبوی کی تبویب عہدِ بنی اُمیہ میں ہوئی اور تدوینِ حدیث میں مختلف ابواب شامل ہوئے۔ تفسیر کا باب بھی ان ابواب میں شامل تھا۔ تفسیر کی الگ کوئی تألیف نہ ہوئی تھی، جس میں ہر سورۃ اور ہر آیت کی تفسیر شامل ہوتی۔

جس تفسیر کی نسبت رسول اللہؐ یا اصحابِ رسولؐ سے کی گئی تھی اس کی چھان بین پر علماء نے بہت توجہ کی۔ یا جو تفسیر تابعین سے منسوب تھی اس پر بھی علماء نے بڑی تنقید سے کام لیا۔ (اس چھان بین کے بعد جو صحیح ثابت ہوئی اُسے قبول کیا گیا) اس کے ساتھ ہی جمع الحدیث کا بھی علماء نے اہتمام کیا۔ اس بارے میں پہلے نقاد درج ذیل علماء ہیں: یزید بن ھارون السلمی متوفی ۱۱۷ ھجریہ، شعبۃ ابن الحجاج المتوفی ۱۶۰ ھجریہ، وکیع ابن الجراح المتوفی ۱۹۷ ہجریہ، سفیان ابن العیینہ المتوفی ۱۹۸ ہجریہ، روح ابن عبادۃ البصری المتوفی ۲۰۵ ہجریہ، عبدالرزاق ابن ھمام۔ عبدالرزاق ابن ہمام

المتوفی ۲۲۱ ہجریہ، آدم ابن ابی ایاس المتوفی ۲۲۰ ھجریہ اور عبدابن حمید المتوفی ۲۴۹ ھجریۃ۔ ان کی روایات ان کی اسناد کے ساتھ کتب التفسیر میں منقول ہیں۔ ان کے بعد وہ علماء وجود میں آئے جنہوں نے حدیث کی تدوین سے الگ تفسیرِ قرآن ہی پر کتابیں تالیف کی ہیں اور وہ درج ذیل ہیں: ابن ماجۃ المتوفی ۲۷۳ ھجریۃ، ابن جریر الطبری المتوفی ۳۱۰ ہجریہ، ابوبکر ابن المنذر نیشا پوری، الحاکم المتوفی ۴۰۵ ھجریۃ اور ابوبکر بن مردویہ المتوفی ۴۱۰ ھجریہ وغیرھم رحمھم اللہ تعالیٰ۔ مذکورہ بالا علماء کی تفاسیر کی اسناد رسول اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں۔ صحابہؓ اور تابعین، تبع تابعین تک بھی ان کی اسناد پہنچتی ہیں۔ بعض آراء کو وہ ترجیح دیتے ہیں۔ بعض نے اعرابِ کلمات کا بھی اہتمام کیا ہے جیسے امام ابن جریر اور طبری وغیرہ۔

ان کے بعد آنے والے مفسرین نے مختصر اسناد کے ساتھ تفاسیر لکھی ہیں اور انہوں نے سابق منقول تفاسیر سے تجاوز نہیں کیا۔ انہوں نے مختلف اقوال کو جمع کیا مگر ان اقوال کو ان کے قائلین کے ساتھ منسوب نہیں کیا۔ اس طرح صحیح اور سقیم (کمزور) تفسیر میں تمیز باقی نہ رہی۔ علوم میں وسعت پیدا ہوئی تو اختلافات بھی بہت زیادہ ہوئے۔ مذہبی اور تقلیدی تعصبات بھی ابھرے۔ اس طرح فلسفی علوم سابق منقول علوم کے ساتھ گڈمڈ ہوگئے۔ جیسے فخر الدین رازیؒ اور جصاص ایسے فقہاء نے منقول تفاسیر میں اپنی آراء کو داخل کر دیا۔ بدعتی علماء نے اپنے مسلک کی تائید میں آیات کی دوراز کار تاویلات کیں۔ جیسے الرمانی اور قاضی عبدالجبار زمخشری وغیرھما۔ ان کی تاویلات کی وجہ سے سابق منقولہ تفاسیر پر ان کی آراء غلبہ ہوگیا۔ (جو کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا)۔

التفسیر الموضوعی

تفسیر کی تدوین کے زمانوں میں تفسیر موضوعی بھی وجود میں آ گئی۔ تاکہ بحث وتمحیص کے ذریعے حق واضح ہوجائے۔ اس میں تمیز کے لئے علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''التبیان فی اقسام القرآن'' ابوعبیدہ نے ''مجاز القرآن'' الراغب الاصفہانی نے ''مفردات القرآن'' اور ابوالحسن الواحدی نے ''اسباب النزول'' اور الجصاص نے ''احکام القرآن'' کی چودہ جلدیں تالیف کیں۔

سوال: طبقات المفسرین پر نوٹ لکھیں۔

جواب: مفسرین کے درج ذیل طبقات ہیں:

1- **مفسرین صحابہؓ:** ان میں مشہور مفسرین خلفاء راشدین (چاروں)، ابن مسعود، ابن عباس، ابی ابن کعب، زید ابن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ ابن الزبیر، انس ابن مالک، ابوھریرۃ، جابر، عبداللہ بن عمر ابن العاص رضی اللہ عنھم ہیں۔ خلفاء میں سے حضرت علیؓ کی زیادہ تفسیری روایات ہیں۔ تین خلفاء کی روایات بہت کم ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے بہت پہلے فوت

ہو گئے تھے۔

حضرت علیؓ نے منبر پر فرمایا: مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو۔ میں ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن میں؟ ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے: میں قرآن کی ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی ہے؟ ''اگر میں جان لوں کہ کوئی مجھ سے زیادہ قرآن کو جانتا ہے تو میں ضرور سوار ہو کر اس کے پاس جاؤں گا''۔

2- **مفسری تابعین**: امام ابن تیمیہؒ نے کہا ہے۔ ''سب لوگوں سے قرآن کو زیادہ جاننے والے اہل مکہ ہیں اس لئے کہ وہ زیادہ تر ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ جیسے مجاہد، عطاء بن ابی رباح، ابن عباس کا آزاد کردہ غلام عکرمہ، سعید بن جبیر اور طاؤس وغیرھم رحمھم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ حسن بصری بھی اسی طبقے میں شامل ہیں۔ یہ سب تابعین میں سے پہلے قرآن کے مفسر ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اصحاب نبیؐ سے علم قرآن سیکھا ہے۔

3- پھر اس طبقہ کے بعد ان لوگوں کا طبقہ ہے جنہوں نے صحابہؓ اور تابعین کے اقوال سے بہت زیادہ تالیفات کی ہیں۔ ان میں نمایاں سفیان بن عیینہ، وکیع ابن الجراح اور شعبہ ابن الحجاج ہیں یہ اپنی روایات کی اسناد صحابہؓ اور تابعین تک پہنچاتے ہیں۔

4- پھر ان کے بعد دوسرے طبقات ہیں۔ ان میں سے نمایاں علی بن ابی طلحہ اور ابن جریر طبری ہیں۔

5- پانچویں طبقہ نے لغوی فوائد سے بھرپور بہت سی تصانیف کی ہیں۔

6- چھٹے طبقہ میں متاخرین مفسرین شامل ہیں۔ جنہوں نے مختصر اسانید کے ساتھ تفاسیر تالیف کی ہیں۔

7- پھر ہر وہ شخص جس میں عربی زبان کی صلاحیت تھی تفسیر کرنے لگے۔ انہوں نے متفق علیہ امر میں بھی بہت سے اقوال داخل کر دیئے۔ اس کی مثال سورۃ الفاتحہ کی آیت ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' کے بارے میں ان کے دس اقوال ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اس آیۃ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

8- پھر کچھ لوگوں نے جنہیں کچھ علم حاصل تھا، انہوں نے اپنی طبیعت اور اپنے مسلک کے مطابق تفاسیر تالیف کیں اور ہر رطب و یابس ان میں داخل کر دیا۔ جو نحوی تھا، اس نے اعراب کے بارے میں موشگافیاں کیں۔ اگرچہ ان کی وجوہ دور از کار اور بے فائدہ تھیں۔ جیسے ابن حیان نے اپنی کتاب ''البحر والنھر'' میں نحو ہی پر زور دیا ہے۔ اخباری یعنی مؤرخ نے قصہ گوئی پر ہی اکتفا کر لیا، اگرچہ وہ صحیح ہوں یا باطل۔ یہ کام ثعلبی نے انجام دیا ہے۔ فقیہ نے تمام آیات کی شرح میں اپنے مسلک کی فقہ کو بیان کر دیا اور فروع کے دلائل کا اہتمام کیا جن کا آیۃ کی شرح سے کوئی

تعلق نہیں تھا۔ ☆عقلی علوم کے حامل امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں فلسفیوں کے اقوال ٹھونس دیئے۔ ابوحیان نے ''البحر'' میں کہا ہے: امام فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سے ایسے امور ذکر کیے ہیں جن کا تفسیر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کسی عالم نے کہا ہے کہ ''کشاف'' میں تفسیر کے علاوہ سب کچھ ہے''۔ ☆بدعتی کا تو مشن اور مقصد ہی تحریف فی الآیات ہوتا ہے۔ جسے البلقینی نے کہا ہے: میں نے ''کشاف'' سے اعتزال کا نتیجہ بھی پایا ہے۔ یہی حالت ملحدین (بے دین لوگوں) کی ہے۔

9- اس کے بعد تحریکِ حدیث قائم ہوئی تو اکثر مفسرین نے نیا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے اپنے زمانے کے افکار پر تنقید کرتے ہوئے قرآنی حقائق کو پیش کیا۔ جیسے محمد عبدہٗ، سید محمد رشید رضا، محمد مصطفےٰ المراغی اور سید قطب اور محمد عزۃ الدروزۃ وغیرھم نے تمام تفاسیر کی چھان پھٹک کی ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۹۱ ھجریہ نے اپنی کتاب ''طبقات المفسرین'' میں ذکر کیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں نقل کیا ہے کہ صحابہؓ، تابعین اور تبع تابعین اور اہل سنت مفسرین کی تفاسیر ہی قابلِ ترجیح ہیں۔ اہل عراق سے معتزلہ اور شیعہ نے بھی تفاسیر تالیف کی ہیں مگر وہ قابلِ ترجیح نہیں ہیں۔ حافظ شمس الدین بن محمد بن علی بن احمد المتوفی ۹۴۵ ھجریہ نے بھی اپنی مشہور کتاب ''طبقات المفسرین'' وہ کتاب ہر اسلامی لائبریری میں ہونی چاہئے۔ اس میں داوودی نے مفسرین کی سیرت ذکر کی ہے۔ حاجی خلیفہ نے ''کشف الظنون'' میں کہا ہے کہ حاجی شمس الدین کی کتاب ''طبقات المفسرین'' اس بارے میں بہترین تصنیف ہے۔

سوال: صحابہؓ اور تابعین سے منقول تفاسیر اور تفسیر بالرائی پر تبصرہ کیجئے۔

جواب: تفسیر بالماثور وہ تفسیر ہے جس کا سہارا صحیح منقول اسناد پر ہوتا ہے۔ اور مفسرین میں سابق مذکورہ تمام شرائط پائی جائیں۔ یا وہ تفسیر صحابہؓ سے مروی ہو۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ دس آیات پڑھ کر نبیؐ سے ان کی شرح و تفسیر پوچھے بغیر آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سورۃ البقرۃ یاد کرنے اور سمجھنے میں آٹھ سال صرف کیے تھے۔ اسے امام مالکؒ نے الموطا میں روایت کیا ہے۔

فرمانِ باری ہے: ﴿افلا یتدبرون القرآن﴾ ''وہ قرآن میں غور و تدبر کیوں نہیں کرتے؟'' اور تدبر کے لئے معانی کو سمجھنا لازم ہے۔ جس طرح کوئی آدمی طبی علوم پڑھتا ہے تو الفاظِ طب کا مفہوم سمجھے بغیر وہ طبیب نہیں بن سکتا اسی طرح قرآنی آیات کو سمجھے بغیر کوئی شخص مفسر نہیں بن سکتا۔ تابعین میں وہ بھی ہیں جنہوں نے پوری تفسیر صحابہؓ سے سیکھی ہے۔ جیسے مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''میں نے سورۃ فاتحہ سے لے کر ختم قرآن تک تین دفعہ مصحف کو ابن عباسؓ پر پیش کر کے ہر آیت کی شرح و تفسیر پوچھی ہے۔

الاختلاف فیہ

تفسیرِ ماثور (منقول) کا دار و مدار صحابۂ اکرام سے نقلِ صحیح پر ہے۔ ان میں تعبیرِ آیات میں بہت تھوڑا اختلاف تھا۔ آیت کے معانی میں وہ سب متفق تھے۔ امام ابن تیمیہ نے کہا ہے:

صحابہ کے اختلافِ تفسیر کی دو اقسام ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کی تعبیر و تشریح میں ان کے الفاظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر مفہوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

☆ دوسری قسم یہ کہ کوئی صحابیؓ اسم عام سے کئی ایک فروع کا تمثیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اس کی مثال سورۂ فاطر کی آیت نمبر۳۲ ہے جس کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ ایک صحابیؓ نے یہ تعبیر کی ہے۔ کہ سابق سے مراد وہ شخص ہے جو اول وقت میں نماز پڑھتا ہے۔ مقتصد سے وہ شخص مراد ہے جو درمیانے وقت میں نماز ادا کرتا ہے۔ اور ظالم لنفسہ سے وہ شخص مراد ہے جو عصر کی نماز بہت تاخیر سے پڑھتا ہے۔ ﴿ثم أورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد و منهم سابق بالخيرات﴾ اس آیت میں تین قسم کے مسلمینؓ کا ذکر ہے:

ا۔ ظالم لنفسہ، ۲۔ مقتصد، ۳۔ سابق بالخیرات۔ ایک صحابیؓ نے پہلی تعبیر کی ہے جو آیۃ سے پہلے ذکر کر دی گئی ہے۔ دوسرے صحابیؓ نے سابق سے زکوٰۃ کے ساتھ مزید صدقہ کرنے والا، المقتصد سے صرف فرض زکوٰۃ ادا کرنے اور ظالم لنفسہ سے زکوٰۃ ادا کرنے والا مراد لیا ہے۔

کبھی تعبیر کے الفاظ متقارب المعنی ہوتے ہیں۔ جیسے (عسعس) کا لفظ ہے اس کا معنی رات کا آنا بھی ہے اور رات کا ختم ہونا بھی ہے۔

اسرائیلیات سے پرہیز کرنا

کچھ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسرائیلی روایات وارد کی ہیں جن میں امت مسلمہ کو کوئی فائدہ نہیں ہے اور نہ ان کا جاننا ہمارے لئے لازم ہے۔ جیسے اصحاب الکھف کے ناموں، ان کی تعداد اور کتے کے رنگ پر اسرائیلی روایات میں ذکر ہے۔ ان امور کا جاننا امت مسلمہ پر لازم نہیں ہے۔ اس بحث و تمحیص سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکھف کی آیت نمبر۲۲ نازل کی ہے:

﴿قل ربي أعلم بعدتهم ما يعلمهم الا قليل فلا تمار فيهم الا مراء ظاهراً﴾ (اے نبیؐ) کہہ دیجئے: میرا ربّ ہی ان کی تعداد کو زیادہ جانتا ہے۔ (ان کی تعداد کو) بہت تھوڑے لوگ جانتے ہیں۔ سو آپ اس بارے میں کوئی جھگڑا نہ کریں جو آیت کا ظاہر ہے اسی پر اکتفاء کریں۔

صحیح رویہ تو یہ ہے کہ جو تفسیر نبیؐ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہوا سے قبول کیا جائے۔

اسی طرح اُس بچے کا نام جسے خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا، ان پرندوں کے نام جن کا

ابراہیم علیہ السلام کے اطمینانِ قلب کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ کشتی نوح میں کس درخت کی لکڑی استعمال کی گئی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کس درخت کی لکڑی تھی ان امور کو جاننے کی امت مسلمہ پابند نہیں ہے۔ فرمانِ رسولؐ ہے: ﴿اذا حدثکم اهل الکتاب فلاتصدقوهم ولا تکذبوهم﴾ "جب اہل کتاب تمہیں کوئی بات بتائیں تو نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو" اس فرمانِ رسولؐ سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تفسیر میں اسرائیلی روایات وارد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

نبیؐ اور صحابہؓ سے منقول تفسیر کا حکم

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں۔ ایک وہ جسے اہلِ عرب الفاظِ کلام کی معرفت سے جانتے ہیں۔ دوسری وہ ہے جسے کوئی جاہل پیش کرتا ہے۔ تیسری وہ جسے علماء ہی جانتے ہیں۔ چوتھی وہ جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ کے رسولؐ نے قرآن کے واجبات، مستحبات، اور منہیات کے بارے میں وضاحت فرمادی ہے۔

کسی آیت کے حکم سے متعلق شرح و وضاحت وہی قابلِ ترجیح ہے جو رسولؐ اللہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہو۔ بعض وہ امور ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسے آنے والے واقعات کی خبر دینا، قیامت قائم ہونے کا وقت، صور میں پھونکنے کا ذکر، عیسیٰ بن مریم کا نازل ہونا، ان سب امور کے وقوع کا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔ اس بارے میں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

التفسیر بالرأی

تفسیر بالرأی اکثر اہل بدعت اور صوفیاء انجام دیتے ہیں اور وہ اپنے فاسد اور باطل عقیدے کی تائید میں دور از کار تاویلات کرتے ہیں۔ جن کا روحِ اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ ان میں کوئی اچھی تعبیرات کا بھی حامل ہوتا ہے جیسے فخر الدین رازی نے "کشاف" میں معتزلہ کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں سے بعض دوسروں سے ہلکے اور معتدل ہیں۔ ان میں سے بعض اہلِ کلام اپنے مسلک کی تائید میں آیاتِ قرآن کی باطل تاویلات کرتے ہیں۔

تفسیر بالرأی کا حکم

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ فیصلہ کن ہے: ﴿من قال فی القرآن برأیه أو بمالایعلم فلیتبوأ مقعده من النار﴾ جس شخص نے قرآن کی (تفسیر) اپنی رائے اور بے علمی سے کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے"۔ (رواہ الترمذی والنسائی وابوداؤد وحسنہ الترمذی)

سورۂ عبس کی آیت نمبر ۳۱: ﴿فاكهة و ابا﴾ میں ابا کا مفہوم حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کہ اگر میں اپنی رائے سے کلام اللہ کی شرح و تفسیر کروں تو جس کا مجھے علم نہیں ہے کونسا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کونسی زمین مجھے برداشت کرے گی؟

امام ابن جریر طبری نے کہا ہے کہ قرآنی آیات کی تعبیر و تشریح وہی قابل قبول ہے جو رسول اللہؐ سے منصوص طور پر ثابت ہو۔ اگر کوئی شخص اپنی رائے سے کوئی تفسیر کرتا ہے، اگرچہ وہ حق کے مطابق ہو تب بھی وہ خطاء کار ہے۔

ان آثار سے معلوم ہوا کہ علماء حق غالباً تفسیر قرآن سے گریز کرتے تھے۔ جس امر کا انہیں علم نہیں ہوتا تھا اس کے بارے میں اپنی رائے پیش نہیں کرتے تھے۔ علماء حق نے اپنی علم کے مطابق قرآن کی تفسیر کی ہے اور وہ قابل قبول ہے۔ سلف صالحین صحابہؓ، آئمہ، تابعین اور علماء امت نے جو تأویلات کی ہیں، وہ قابلِ ترجیح اور قابلِ قبول ہیں۔

الاسرائیلیات

جو یہود و نصاریٰ اسلام میں داخل ہو گئے تھے وہ اپنی دینی ثقافت کے بھی حامل تھے۔ جب قرآنی قصے پڑھتے تھے۔ خاص طور پر انبیاء کے قصے تو ان کے بارے میں تورات و انجیل کی خبریں دیتے تھے۔ صحابہ فرمانِ رسولؐ کے مطابق توقف کرتے تھے۔ یعنی نو مسلم یہود و نصاریٰ کی تأویلات کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ فرمانِ رسولؐ تھا: "قولوا آمنا بالله وما أنزل الينا" وہ خبریں جو اسلام میں داخل ہونے والے یہود و نصاریٰ پیش کرتے تھے انہیں اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسرائیلیات بھی داخل کی ہیں حالانکہ ان کے شمول کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صحابہؓ نے تفسیر قرآن میں اسرائیلیات کے شمول سے گریز کیا ہے۔ جب تابعین کا عہد آیا۔ اور کثرت سے یہود و نصاریٰ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو تابعین نے اپنی تفاسیر میں بکثرت اسرائیلیات کو شامل کیا۔ زیادہ تر اسرائیلیات چار اشخاص سے لی گئی ہیں۔ ۱۔ عبداللہ بن سلام، ۲۔ کعب الاحبار، ۳۔ وھب ابن منبہ، ۴۔ عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ۔ عبداللہ بن سلام ان سب سے زیادہ عالم تھے۔ علماء اسلام نے ان کی توثیق میں اختلاف کیا ہے۔ امام بخاری اور اور دوسرے محدثین نے عبداللہ بن سلام پر اعتماد کیا ہے اور ان پر کوئی تہمت نہیں لگائی۔ مگر کعب الاحبار اور وھب بن منبہ سے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے۔

تفسیر الصوفیہ

تصوف کی اصطلاح ان لوگوں نے وضع کی ہے جو شرعی فرائض سے بے نیاز رہنا چاہتے

ہیں۔ نیز دنیوی جنجال سے گلوخلاصی چاہتے ہیں۔ ایسے زہد کی اسلامی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جن تین بدوی مسلمانوں میں ایک نے کہا تھا کہ پوری عمر میں شادی نہیں کروں گا، اس ارادے میں بھی معروف تصوف کی جھلک تھی۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اس کی تردید کی تھی۔ تنگ زندگی بسر کرنا صوفیا کا مرکزی خیال ہے۔ ان کے نزدیک جنت کی طلب کرنا زہد کے خلاف ہے۔ حالانکہ رسولؐ اللہ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس طلب کیا کرو۔ ان کا ایک انتہائی گمراہ کن عقیدہ ہے کہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا وجود شامل ہے۔ اسے نظریۂ وحدت الوجود کا نام دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک تمام ملتیں ایک ہی درجہ رکھتی ہیں۔ ابن عربی ان کا سرخیل ہے۔ وہ نظریۂ وحدۃ الوجود کی تائید کے لئے قرآنی آیات کی باطل تاویلات کرتے ہیں۔ سورۃ مریم کی آیت ۵۷ ﴿ورفعنه مكانا عليا﴾ کی تاویل کرتے ہیں کہ تمام امکنہ سے اعلیٰ مکان وہ ہے جہاں عالم الافلاک کی چکی گھومتی ہے اور وہ سورج کا فلک ہے۔ اس مقام میں ادریس علیہ السلام کی روح ہے۔ اور ﴿وانتم الاعلون ان كنتم مومنين﴾ ان کے نزدیک اعلیٰ مقام محمدیوں کے لیے ہیں۔ جو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ صوفیاء کے خاص مقام ہیں جس تک عام مومنین نہیں پہنچ سکتے۔ کتنا واہیہ نظریہ ہے؟ یہ اور اس طرح کی دوسری تفاسیر میں نصوص کو غیر ظاہر یعنی باطن معانی پر محمول کیا گیا ہے۔ اس نظریہ نے صوفیاء کو الحاد اور بے مقصد زندگی کا خوگر بنا دیا ہے۔

التفسیر الاشاری

ان صوفیاء میں سے ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ روحانی ریاضت (مشق) سے صوفی اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے جس سے قرآنی عبارات کے ماوراء، اسے قدسی اشارات حاصل ہوتے ہیں۔ جن سے قرآنی عبارات کا باطنی علم انہیں حاصل ہوتا ہے۔ پھر وہ ان اشاراتِ قدسیہ کے ذریعے قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔ اس عقیدے کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ایسی تفسیر شریعت میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ صوفیا ایک دلیل ابن عباسؓ کی ایک روایت سے اخذ کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی مجلسِ خاص میں شیوخ کے ساتھ ابن عباسؓ کو بھی داخل کرتے تھے۔ اس پر شیوخ کو کچھ ناراضگی ہوئی کہ آپؓ اس نوعمر کو خاص مجلس میں کیوں داخل کر رہے ہیں؟ ہمارے بیٹے بھی ابن عباسؓ جیسے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ان کے (علمی درجے کو) تم جانتے ہو۔ ایک بار عمرؓ نے ابن عباسؓ کو بلایا۔ ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں اس لئے بلایا ہے کہ شیوخ کو علمی برتری دکھائیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے سب شیوخ سے سوال کیا کہ فتح مکہ کے بعد سورۃ النصر کی تاویل کیا ہے؟ کسی شیخ نے کہا کہ اس میں ہمیں حمد واستغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ جبکہ ہمیں فتح عطا کی گئی ہے۔ بعض شیوخ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ پھر ابن عباسؓ سے فرمایا: آپ اس بارے میں کیا کہتے

ہیں؟ ابن عباسؓ نے کہا: اس سورۃ میں رسولؐ اللہ کی وفات کی خبر دی گئی ہے۔ مکہ کی فتح آپ کی وفات کی علامت ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: مجھے بھی اس سے یہی معلوم ہوا ہے جو آپ کو معلوم ہوا ہے۔ (راوہ البخاری)۔ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ تفاسیر کے تین اصول ہیں۔ ۱۔ تفسیر اللفظ۔ اسی کی طرف متاخرین کا میلان ہے۔ ۲۔ تفسیر علی المعنی۔ اور وہ ہے جس کا ذکر سلف صالحین نے کیا ہے۔ ۳۔ تفسیر علی الاشارۃ۔ اکثر صوفیاء کا میلان اسی طرف ہے۔ اگر چار شروط کی پابندی کی گئی ہو تو ان میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (۱) یہ کہ وہ آیۃ کے معنی مفہوم کے مخالف نہ ہو۔ (۲) دوسری شرط یہ کہ آیۃ کا صحیح معنی ذکر کیا گیا ہو۔ (۳) تیسری یہ کہ تفسیری الفاظ میں مفہوم موجود ہو۔ (۴) چوتھی یہ کہ تفسیر اور آیۃ کے مفہوم کے درمیان ارتباط و تلازم ہو۔ یعنی آیۃ اور اس کے مفہوم کے درمیان لازماً ربط و تعلق ہو۔

غرائب التفسیر

کچھ لوں کو اپنے قول میں نامانوس الفاظ شامل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ جن کے سمجھنے میں سامع اور قاری کو دشواری پیش آتی ہے۔ کچھ عجائب و غرائب کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

1- الم۔ کے الف کا کسی نے اللہ معنی کیا ہے۔ اور لام سے مراد منکرین نے محمد کی بعثت کا تکبر اور گمراہی کی بناء پر انکار کیا ہے۔

2- حم عسق کی حا سے علی اور معاویہ کے درمیان حرب (جنگ کا) اشارہ ہے۔ میم سے مراد اولادِ مروان اُموی ہے۔ عین سے عباسی حکومت مراد ہے۔ سین سے سفیان کی ولایت مراد ہے۔ اور قاف سے مہدی کا قدوہ (سیرت) مراد ہے۔ حالانکہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ حروفِ مقطعات کی مراد کو اللہ ہی جانتا ہے۔ مگر بعض مفسرین نے اندھیرے میں لاٹھی چلائی ہے۔

3- سورۃ البقرۃ کی آیت: ۲۶۰ ﴿ولکن لیطمئن قلبی﴾ ابن فورک نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا ایک دوست تھا۔ جسے آپؑ نے "قلب" کہا ہے۔ اسے اطمینانِ قلب دلانے کے لیے اللہ نے چار پرندوں کا مشاہدہ کرایا تھا۔ بھلا خلیل اللہ کیسے موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر غیر مطمئن ہو سکتے تھے۔ لو دیکھئے ابن فورک کی در فطنی۔

4- ابی معاذ نحوی نے سورۃ یٰسین کی آیۃ: ۸۰ ﴿الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا﴾ شجر اخضر سے مراد ابراہیم علیہ السلام اور نارا سے مراد نور اور نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم لئے ہیں۔ ﴿فاذا انتم توقدون﴾ "پھر جب تم آگ جلاتے ہو۔ آیۃ کا صریحاً یہی معنی ہے۔ مگر معاذ نحوی توقدون کا مفہوم۔ تقتبسون الدین بیان کرتا ہے۔ یعنی تم دین کا علم حاصل کرتے ہو۔ حماقت اور جہالت کے یہ کرشمے ہیں۔

سوال: تفسیر کی مشہور کتابوں کا ذکر کیجئے۔

جواب: اسلامی لائبریریاں کتب التفسیر بالماثور اور کتب التفسیر بالرائی سے بھری ہوئی ہیں۔ تفسیر کی بعض کتابیں زیادہ مشہور ہیں جو لوگوں کے ہاتھ میں متداول ہیں۔

نبیؐ اور اصحابِ نبیؐ سے منقول مشہور کتابیں:

(۱) عبداللہ بن عباسؓ کی کتاب۔ (۲) تفسیر ابن عیینہ۔ (۳) تفسیر ابن ابی حاتم، (۴) تفسیر ابی الشیخ ابن حبان، (۵) تفسیر ابن عطیہ، (۶) تفسیر ابی اللیث السمرقندی، (۷) تفسیر ابی اسحاق ''الکشف والبیان عن تفسیر القرآن، (۸) تفسیر ابن جریر الطبری'' جامع البیان فی تفسیر القرآن''۔ (۹) تفسیر ابن ابی شیبہ۔ (۱۰) تفسیر البغوی ''معالم التنزیل''۔ (۱۱) تفسیر ابی الفداء الحافظ ابن کثیر ''تفسیر القرآن العظیم''۔ (۱۲) تفسیر الثعالبی ''الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن''۔ (۱۳) تفسیر جلال الدین سیوطی ''الدر المنثور فی تفسیر بالماثور۔ (۱۴) تفسیر الشوکانی ''فتح القدیر''۔

تفسیر ابن عباسؓ

تفسیر کا بہت بڑا حصہ ابن عباسؓ کے ساتھ منسوب ہے۔ ''تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباسؓ '' مصر میں کئی دفعہ چھپی ہے۔ ابن عباسؓ حق طور پر ''ترجمان القرآن'' تھے۔ اہلِ کتاب کی جو تفسیر قرآن سے متفق تھی اسے ابن عباسؓ سے بعض مقامات میں درج کیا ہے۔ استاذ گولڈ زیھر اور پروفیسر احمد امین نے اپنے رسالہ ''فجر الاسلام'' اور پروفیسر گولڈ نے ''المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن'' میں تفاسیر القرآن پر اعتراض کیے ہیں کہ مفسرین کی اکثریت نے اپنی تفاسیر میں اہلِ کتاب کے حوالہ جات کیوں درج کیے ہیں؟ پروفیسر محمد حسین الذھبی نے اپنی کتاب ''التفسیر و المفسرین'' میں ان دونوں کی تہمت کا رد کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے بنیادی عقائد اور اصول و فروع دین میں اہلِ کتاب کے کسی امر کو اپنی تفسیر میں داخل نہیں کیا۔ بلکہ وہ ان کی اسی تحقیق کو اخذ کرتے ہیں جو بعض قصوں اور گذشتہ خبروں پر مشتمل اور اس میں شک و شبہ نہ کیا جا سکے۔ ابن عباسؓ نے الفاظ قرآن کو سمجھنے میں عربی اشعار سے استفادہ کیا ہے۔ ابن عباسؓ کی روایات کی علماء حق نے صحت اور ضعف کے لحاظ سے چھان پھٹک کی ہے اور ان کے معیارِ صحت پر اتفاق کیا ہے۔

طریق معاویہ بن صالح عن علی ابن ابی طلحہ عن ابن عباسؓ۔ امام احمد رحمۃ اللہ نے کہا ہے: ''مصر میں ایک صحیفہ ہے جسے علی بن ابی طلحہ نے روایت کیا ہے۔ اس اسناد کو امام بخاری نے بھی اختیار کیا ہے۔ دوسری اسناد قیس بن مسلم الکوفی عن عطاء ابن السائب عن سعید ابن جبیر عن ابن عباسؓ یہ طریق (اسناد) بھی بخاری و مسلم کی شرائط پر صحیح ہے۔

اسی طرح علماء جرح وتعدیل نے ابن عباسؓ کی ۱۹ اسناد کی چھان پھٹک کر کے فیصلہ دیا ہے کہ ابن عباسؓ نے ثقہ راویوں کے طریق سے اپنی تفسیر کو آراستہ کیا ہے۔

جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری

ابن جریر طبری عظیم القدر ائمۂ اسلام میں سے ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ بہت سے علوم کے ماہر ہیں۔ وہ اپنی دو کتابوں "تاریخ الامم والملوک" اور تفسیر "جامع البیان فی تفسیر القرآن" کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے ایسا اسلامی علمی ورثہ چھوڑا ہے جسے تمام زمانوں کی نسلیں آج تک نقل کرتی آئی ہیں۔

تفسیر ابن جریر تیس بڑی جلدوں میں ہے۔ کوئی تفسیر القرآن کا طالبعلم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ قرآن کامل کی سب سے پہلی کامل تفسیر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے: امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ محمد ابن جریر رحمہ اللہ کی تفسیر جیسی کوئی تفسیر تصنیف نہیں کی گئی ہے۔ وہ تفسیر لغات کی تائید اشعار عرب کے ذریعے کرتے ہیں۔ (۳) "المحرز الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز لابن عطیہ" ابن عطیہ اندلس کے مشہور قاضی تھے۔ وہ جلیل القدر، علوم حدیث و التفسیر و اللغۃ والادب کے عارف تھے۔ وہ مالکی مذہب سے متعلق تھے۔ یہ تفسیر دس بڑی جلدوں میں ہے۔ شیخ محمد الذھبی نے ذکر کیا ہے کہ اس تفسیر کی چار جلدیں مصر کی لائبریری میں موجود ہیں باقی چھے جلدیں مفقود ہیں۔

(۴) تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر۔ عماد الدین ابو الفدآء اسماعیل بن عمرو ابن کثیر جلیل القدر حافظ تھے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں امام ابن تیمیہ کی پیروی کی ہے۔ علماء نے ان کے علم فی التفسیر والحدیث والتاریخ کی عظمت کی شہادت دی ہے۔ ان کی کتاب التاریخ "البدایۃ والنھایۃ" اسلامی تاریخ کا اصل مرجع ہے۔ ان کی تفسیر، تفسیر طبری کے بعد دوسرا درجہ رکھتی ہے۔ وہ قرآن کی تفسیر میں احادیث و آثار کو اسناد کے ساتھ ذکر کرتے ہیں ساتھ ہی ان کی صحت وضعف بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ دوسری تفاسیر میں منکرات اور اسرائیلیات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اس طرح احکام فقہیہ میں علماء کے اقوال بھی درج کرتے ہیں۔

اشھر الکتب المؤلفۃ فی تفسیر بالرأی

(۱) تفسیر عبدالرحمان بن کیسان الاصم۔ (۲) تفسیر ابی علی الجبائی۔ (۳) تفسیر عبدالجبار۔ (۴) تفسیر الزمخشری "الکشاف"۔ (۵) تفسیر فخر الدین "مفاتیح الغیب"۔ (۶) تفسیر ابن فورک۔ (۷) تفسیر النسفی "مدارک التنزیل وحقائق التاویل"۔ (۸) تفسیر الخازن "لباب التاویل فی معانی

التنزیل"۔ (۹) تفسیر أبی حیان۔ "البحر المحیط"۔ (۱۰) تفسیر البیضاوی "انوار التنزیل و اسرار التأویل"۔ (۱۱) تفسیر الجلالین۔ جلال الدین المحلی و جلال الدین السیوطی۔ جلال الدین المحلی نے سورۃ الکھف سے اپنی تفسیر میں ابتداء کر کے والناس تک تکمیل کی۔ پھر اس نے سورۃ الفاتحہ سے ابتدا کی مگر موت نے باقی تفسیر کی مہلت نہ دی۔ پھر جلال الدین سیوطی نے اس تفسیر کی تکمیل کی۔ (۱۲) تفسیر القرطبی "الجامع لأحکام القرآن"۔ (۱۳) تفسیر ابی مسعود "ارشاد العقل السلیم الی فرایا الکتاب الکریم"۔ (۱۴) تفسیر الآلوسی "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع الثانی"۔

(۱) "مفاتیح الغیب للرازی۔ فخر الدین الرازی علوم نقلیہ اور عقلیہ میں بہت ماہر تھے۔ ان کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں۔ ان کی اہم تصنیف التفسیر الکبیر "مفاتیح الغیب" ہے۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔ شیخ محمد الذھبی کہتے ہیں:

"کہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر سورۃ الانبیاء تک لکھی پھر شہاب العزین الخوبی نے اس کی تکمیل کی ہے"۔

(۲) البحر المحیط لأبی حیان۔ ابو حیان الاندلسی الغرناطی عربی لغت کے ماہر، تفسیر، حدیث، تراجم رجال اوران کے طبقات کے بہت معرفت رکھتے تھے۔ ان کی بہت تصنیفات ہیں۔ اہم تصنیف "البحر المحیط" ہے۔ اس تفسیر کی آٹھ بڑی جلدیں ہیں۔ ابو حیان نے اس تفسیر میں وجوہِ اعراب کا بھی اہتمام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نحویوں کے اختلاف کا بھی ابو حیان نے ذکر کیا ہے۔ یہ تفسیر القرآن کی بجائے زیادہ تر نحوی مسائل پر مشتمل ہے۔

(۳) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاتاویل فی وجوہ التأویل للزمخشری۔

الزمخشری النحو، اللغۃ، الأدب اور تفسیر میں بے مثال عالم تھے۔ حنفی المذہب اور اعتقاد میں معتزلی تھے۔ ان کی تفسیر "الکشاف" میں ان کے عقائد کی تائید پائی جاتی ہے۔ بلاغت، بیان، ادب، نحو اور تصریف میں مہارت کی بناء پر زمخشری نے جمال القرآن کو منکشف کیا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی مقدمہ میں لکھا ہے۔ اگرچہ زمخشری عربی لغت کے بہت بڑے عالم تھے۔ مگر جمھور اہل السنۃ نے ان کے معتزلی عقائد کی بناء پر ان پر نکیر کی ہے۔ اور اس لغت وادب کو ترجیح دی ہے۔ جو جمھور اہل السنۃ کی طرف سے وارد ہے۔

جدید عصر میں کتب التفسیر

(۱) الجواہر فی تفسیر القرآن للشیخ طنطاوی الجوھری۔ شیخ طنطاوی۔ **کائناتی طبعی عجائبات** کے بہت شائق تھے۔ وہ تفسیر قرآن میں عقلی علوم بکثرت وارد کرتے ہیں۔ جس طرح جمھور ثقہ علماء نے "الکشاف" سے کنارہ کشی کی ہے اسی طرح طنطاوی کی تفسیر کے بارے علماء کا قول ہے:

"طنطاوی کی تفسیر میں بہت کچھ ہے مگر قرآن کی تفسیر نہیں ہے"۔

تفسیر المنار للسید محمد رشید رضا

سید محمد رشید رضا محمد عبدہ کے عظیم شاگرد ہیں۔ انہوں نے تفسیر کو شروع قرآن سے آغاز کر کے سورۂ یوسف کی آیۃ: ۱۰ تک لکھا تھا کہ ان کی وفات نے تفسیر کی تکمیل نہ ہونے دی۔ انہوں نے رسول اللہؐ اور صحابہؓ سے منقول وضاحتوں کو اپنی تفسیر میں داخل کیا ہے۔ عربی زبان کے اسالیب کا اہتمام کیا ہے۔ معانی ومشکلات کو آسان عربی عبارات سے حل کیا ہے اور معاشرے کے امراض کا علاج قرآنی رہنمائی سے پیش کیا ہے۔ سورۂ یوسف کی اس آیۃ تک ﴿رب قد آتیتنی من الملك و علّمتنی من تأویل الاحادیث فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا و الآخرة توفنی مسلما و الحقنی بالصالحین۔ ۱۰۱ یوسف﴾ تک اپنی تفسیر لکھ سکے۔ یہ تفسیر ۱۲ بڑی جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

فی ظلال القرآن لسید قطب

مصر میں حسن البناء نے اخوان المسلمین کے نام سے جو تحریک قائم کی تھی اس تحریک کے بانی حسن البناء کو جمال عبدالناصر ملحد نے شہید کر دیا تھا اور ہزاروں الاخوان المسلمین کو بھی شہید کر دیا تھا۔ سید قطب بھی اسی تحریک کے اہم رکن تھے۔ انہوں نے امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کے علاج کے لئے ایک جامع اور کامل تفسیر "فی ظلال القرآن" کے نام سے لکھی۔ اس کے مقدمہ میں واضح کیا کہ امتِ مسلمہ کی ذلت اور پستی کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کی طرف رجوع کرے۔ اس طرح وہ ماضی کی رفعت اور سعادت حاصل کر سکتی ہے۔ اس کے سوا اس کے امراض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس تفسیر کی آٹھ جلدیں ہیں۔ اس دور کا مسلم جسے حق کی تلاش ہو، اس تفسیر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

التفسیر البیانی للقرآن الکریم۔ لعائشۃ عبدالرحمان بنت الشاطی

ہماری ہم عصر خواتین میں سے عائشۃ عبدالرحمان بنت الشاطی نے تفسیر القرآن میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ قاہرہ کے کلیۃ الآدب میں تربیت البنات میں عائشہ عبدالرحمان نے اہم تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ ادبی اور لغوی شعبے میں اس نے حکومتی کانفرنسوں میں جامع مانع لیکچرز پیش کئے ہیں۔ اس نے معلقات، مفضلیات، خمریات اور حماسیات سے ملتِ مسلمہ کا رخ موڑ کر قرآن کریم کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ان تفاسیر الاسلاف سے استفادہ

کیا ہے۔ جن میں لغوی بلاغت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

سوال: تفسیر الفقہاء پر تبصرہ کیجیے۔

جواب: رسول اللہؐ کے عہد میں صحابہؓ اپنی فطری صلاحیت قرآن کریم کو سمجھ لیتے تھے۔ اگر کسی آیت کے فہم میں کوئی مشکل پیش آتی تھی تو رسول اللہؐ کی طرف رجوع کر کے اُسے حل کر لیتے تھے۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ وہ قرآن وسنت ہی سے استنباطِ احکام کرتے اور قرآن وسنت ہی سے مشکلات کا حل تلاش کرتے تھے۔ چار سو سال تک صورتِ حال یونہی رہی۔ اس دوران میں مذہبی تعصب نے راہ نہیں پائی تھی۔ اس کے بعد تقلیدی مذاہب پیدا ہوئے۔ اور ہر امام کے مقلد نے اپنے مذہب کے مطابق قرآن کی تفسیر کی اور دوسرے تقلیدی مذاہب پر سخت تنقید کی۔ حالانکہ چاروں اماموں نے صحیح احادیث کو اختیار کرنے کی تلقین کی تھی اور شخصی تقلید سے منع کیا تھا۔ چنانچہ تقلیدی دور میں قرآن تفاسیر میں بہت زیادہ اختلافات وقوع پذیر ہوئے۔ یہ اختلافات آج تک احکامِ آیات میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی تفاسیر کو فقہی تفاسیر کہتے ہیں۔ اور وہ درج ذیل ہیں:

(۱) احکام القرآن للجصاص مطبوع۔ (۲) احکام القرآن للکیا الھر اس۔ مخطوط۔ (۳) احکام القرآن لابن العربی مطبوع۔ (۴) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی۔ مطبوع۔ (۵) الاکلیل فی استنباط التنزیل للسیوطی۔ مخطوط۔ (۶) التفسیرات الاحمدیہ فی بیان الآیات الشرعیہ۔ مطبوع بالھند۔ (۷) تفسیر آیات الاحکام للشیخ محمد السایس۔ مطبوع۔ (۸) تفسیر آیات الاحکام للشیخ مناع القطان مطبوع۔ (۹) اضوآء البیان للشیخ محمد الشنقیطی۔

ان میں بعض کا ہم ذکر کرتے ہیں:

(۱) احکام القرآن للجصاص۔ ابوبکر احمد بن علی الرازی المشہور بالجصاص۔ وہ جص (چونے) کی تجارت کرتے تھے۔ وہ چوتھی صدی ہجری میں حنفی فقہ کے امام ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب "احکام القرآن" اہم فقہی تفسیر ہے۔ انہوں نے زیادہ تر فروعی احکام پر بحث کی ہے۔ انہوں نے مذہبی فقہی اختلافات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب تفسیر القرآن کی بجائے فقہی کتاب شمار ہوتی ہے۔ الجصاص حنفی مذہب کے لئے سخت تعصب کے حامل تھے۔ وہ معتزلہ عقائد کی طرف بھی مائل تھے۔ وہ سورۃ الانعام کی آیت: ۱۰۳ ﴿لا تدرکہ الابصار﴾ ان کا معنی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ پھر سورۃ القیامۃ کی آیات: ۲۲، ۲۳ ﴿وجوہ یومئذ ناضرہ۔ الی ربھا ناظرہ﴾ لکھ کر ناظرہ کی تاویل کرتے ہیں کہ اس کا معنی منتظرہ ہے۔ یعنی لوگ اپنے بارے میں ثواب کا انتظار کریں گے۔ اس لئے کہ عربی زبان رؤیہ کا معنی علم بھی ہے۔ رؤیہ سے متعلق جتنی مرویات ہیں ان سے مراد علم ہی ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور فقہ حنفی کا یہ مرجع ہے۔

(۲) احکام القرآن لابن العربی۔ ابوبکر محمد بن عبداللہ بن عبداللہ بن احمد المعافری الاندلسی الاشبیلی اندلس کے متبحر (عظیم) امام ہیں۔ وہ مالکی المذہب ہیں۔ ان کی کتاب المالکیہ کے نزدیک اہم فقہی تفسیر کا بہت بڑا مرجع ہے۔ یہ معتدل اور انصاف پسند آدمی تھے۔ متعصب نہیں تھے۔ بعض مالکی مسالک کی مخالفت بھی کر گئے ہیں۔ مخالفین کی آراء کو برے طریق سے رد نہیں کرتے۔ وہ آیات سے مستنبط ہونے والے مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں۔ المسئلة الأولیٰ۔ المسئلة الثانیه وغیرھا۔ وہ اسرائیلیات سے نفرت کرتے ہیں۔ سورۃ المائدۃ کی آیت: ۶ ﴿یآ ایها الذین آمنوا اذآ قمتم الی الصلاة فاغسلوا وجوھکم﴾ لکھ کر گیارھویں مسئلہ میں فاغسلوا کے بارے میں امام شافعی کی رائے بیان کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہیں چھوڑ یئے۔ وہ تو دھوئے جانے والے عضو پر بغیر ملنے کی پانی بہانے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے اختلافی مسائل کے ضمن میں وضاحت کی ہے۔ کہ غسل (دھونا) ہاتھ کے ساتھ عضو کو ملنے سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ کتاب کئی دفعہ چھپی ہے۔ کبھی دو بڑی جلدوں میں اور کبھی چار جلدوں میں چھپی ہے۔

(۳) الجامع لأحکام القرآن لأبی عبداللہ القرطبی۔ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری الخزرجی۔ الاندلسی مالکی مسلک کے بے مثال عالم ہیں۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور ان کی کتاب "الجامع لاحکام القرآن" ہے۔ وہ صرف آیات الاحکام ہی کی تفسیر نہیں بلکہ پورے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔ اسباب نزول بھی بیان کرتے ہیں۔ مختلف قرأت، اعراب اور غریب الفاظ کی شرح بھی کرتے ہیں۔ مفسرین کے کئی قصوں کو نظر انداز بھی کر دیتے ہیں۔ اور سابق ثقہ علماء کی شرح کو قبول کرتے ہیں۔ وہ اختلافی مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ مالکی مسلک کے لئے تعصب سے کام نہیں لیتے۔ اس کی مثال سورۃ البقرۃ کی آیت: ۱۸۷ ہے۔ ﴿احل لکم لیلة الصیام الرفث الی نسآئکم﴾ اس آیۃ کی بارھویں مسئلہ میں علماء کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ روزہ دار دن میں اگر بھول چوک سے کچھ کھا پی لے تو روزہ افطار کر دے اور اس کی قضا کرے۔ قرطبی کہتے ہیں غیر مالک کے نزدیک وہ مفطر نہیں ہو سکتا۔ جمھور فقہاء نے یہی کہا ہے کہ روزہ دار دن میں بھول کر کچھ کھا پی لے تو روزہ پورا کرے۔ وہ تو رزق اللہ تعالیٰ نے اُسے میسر کیا ہے۔ اور اس پر قضا نہیں ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس مسئلہ میں قرطبی نے مالکی مسلک کی مخالفت کی ہے۔ قرطبی گمراہ فرقوں۔ معتزلہ، قدریہ، روافض، فلاسفہ اور غالی صوفیاء کی بھی احسن طریق اور واضح دلائل سے تردید کرتے ہیں۔

سوال: بعض مشہور مفسرین کے تراجم لکھئے۔

جواب: (ا) ابن عباسؓ

نسبہ وحیاتہ: عبداللہ ابن عباس ابن عبدالمطلب ابن ہاشم ابن عبد مناف القرشی الھاشمی ابن عم رسول اللہ ﷺ۔ اُمہ ام الفضل لبابۃ بنت الحارث الھلالیۃ۔ ہجرت سے پہلے جب بنو ہاشم شعب ابی طالب میں قید تھے۔ اس دوران ابن عباسؓ پیدا ہوئے۔ جنگ صفین میں یہ میسرہ میں تھے۔ حضرت علیؓ نے انہیں بصرہ کو گورنر بنایا تھا۔ حضرت علیؓ شہید ہوئے تو ابن عباسؓ مکہ میں چلے آئے۔ وفاتِ نبی کے وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی۔ آپؓ کا علمی درجہ۔ ابن عباسؓ ترجمان القرآن اور امت کے عظیم عالم، رئیس المفسرین ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں۔ کثرتِ علم کی وجہ سے ابن عباسؓ کو البحر کہا جاتا تھا۔ نبی کی دعا: "اللھم فقھه فی الدین و علمه التأویل" کا اثر تھا کہ حضرت عمرؓ انہیں کبار صحابہؓ کے ساتھ اپنی مجلسِ شوریٰ میں بٹھایا کرتے تھے۔ جبکہ یہ بچپن میں تھے۔ سورۃ النصر کی تاویل حضرت عمرؓ نے شیوخ سے پوچھی تو کسی نے کہا: کہ اللہ نے ہمیں حمد و استغفار کا حکم دیا ہے کہ اس نے ہمیں فتح مکہ سے نوازا ہے۔ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا تو ابن عباسؓ نے کہا کہ اس میں وفاتِ نبی کی خبر دی گئی ہے۔ یہ سن کر شیوخ کا اعتراض ختم ہو گیا اور حیرت زدہ ہو گئے۔ ابن عباسؓ نے اپنی تفسیر میں ثقہ راویوں کی روایات درج کی ہیں۔ اس میں ایک بہترین سند علی بن طلحہ ہاشمی کی ہے۔ جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں شامل کیا ہے۔ اسی طرح ایک جید سند قیس بن مسلم الکوفی عن عطاء ابن السائب بھی ہے۔ لمبی تفاسیر جن کی نسبت ابن عباسؓ کے ساتھ کی گئی ہے ان کی اکثریت مجہول اسناد پر مشتمل ہے۔ دوسری تفاسیر میں جن روایات کی سند ابن عباسؓ تک پہنچائی گئی ہے ان میں اکثر ردی اور ضعیف و منقطع ہیں۔

(۲) مجاہد بن جبر۔ نسبہ وحیاتہ۔ مجاہد بن جبر المکی ابو الحجاج المخزومی المقری۔ سائب بن ابی السائب کے آزاد کردہ غلام، مجاہد نے حضرت علیؓ، سعد بن ابی وقاص، عبادلہ، رافع بن خدیج، عائشہ، ام سلمہ، ابوھریرہ، سراقہ بن مالک اور عبداللہ ابن السائب رضی اللہ عنہم سے روایات کی ہیں اور مجاہد سے عطاء عکرمۃ، عمرو ابن دینار، قتادہ، سلیمان الاحول، سلیمان الاعمش، عبداللہ بن کثیر القاری اور بہت دوسرے تبع تابعین نے روایت کی ہے۔ وہ خلافت عمرؓ میں ۲۱ ھجریہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۰۲ ہجریہ یا ۱۰۳ ہجریہ میں فوت ہوئے۔

منزلتہ۔ مجاہد تابعین کے سردار اور رئیس المفسرین ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "میں نے تین دفعہ ابن عباسؓ پر مصحف کو پیش کیا۔ میں ان سے ہر آیت کے بارے میں پوچھتا تھا۔ کہ کس کے بارے میں اور کیسے نازل ہوئی؟ ابن تیمیہ نے کہا ہے: "مجاہد کی تفسیر پر امام شافعی اور امام بخاریؒ نے اعتماد کیا

ہے۔سلیمان الثوری کہتے ہیں: جب آپ کے پاس مجاہد کی تفسیر پہنچے تو وہ کافی ہے۔ کبھی ان سے روایت کرنے والے ضعیف بھی تھے۔لہٰذا ان سے روایت کی اسناد کی چھان بین کر لینی چاہیے۔

(۲) الطبری

نسبہ وحیاتہ: محمد بن جریر بن یزید بن خالد بن کثیر ابوجعفر الطبری۔ وہ ۲۲۴ ھجریہ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ ھجریہ میں فوت ہوئے۔ وہ بے مثال عالم اور کثیر الراویہ تھے۔ انہیں تاریخِ رجال اور تاریخ الامم میں بلند درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے بہت کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی اہم تصنیف ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' ہے۔ ان کی تفسیر تفاسیر میں عظیم درجہ رکھتی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''ابن جریر کی تفسیر جیسی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ ابن کثیر اپنی تفسیر میں اکثر انہی کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔

(۳) ابن کثیر رحمہ اللہ

نسبہ وحیاتہ: اسماعیل بن عمر القرشی ابن کثیر البصری ثم الدمشقی عماد الدین ابو الفداء الحافظ المحدث الشافعی۔ ۷۰۵ ہجریہ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ ھجریہ میں فوت ہوئے۔ وہ ماہر مؤرخ تھے۔ حافظ ابن الجزری نے کہا ہے: ابن کثیر محدث فقیہ تھے۔ ان کی تصنیف ''البدایۃ والنھایۃ'' مؤرخین کے لئے اہم مرجع ہے۔

الکواکب الدراری ''البدایۃ والنھایۃ'' ہی سے منتخب کی گئی ہے۔ تفسیر ابن کثیر کی ایک نمایاں خوبی ہے کہ وہ قرآن کی قرآن ہی سے تفسیر کرتے ہیں۔ وہ احادیثِ مرفوعہ کے علاوہ آثار الصحابہ اور اقوالِ تابعین کے ساتھ علماءِ سلف کے اجتهادات کو بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ منکرات اور اسرائیلیات کی نشاندہی کر کے ان سے پرہیز کی بھی تلقین کرتے ہیں۔

(۴) فخر الدین الرازی

نسبہ وحیاتہ: محمد بن عمر بن الحسن التمیمی البکری الطبرستانی الرازی فخر الدین المعروف بابن الخطیب الشافعی الفقیہ۔ شام کے قصبہ رے میں ۵۴۳ ہجریہ میں پیدا ہوئے ور ہرات میں ۶۰۶ ہجریہ میں فوت ہوئے۔

منطق، فلسفہ، علوم دینیہ اور عقلیہ بھی پڑھے۔ علم کلام میں بھی نمایاں درجہ حاصل کیا۔ اسلامی فلاسفہ کے لیے ان کی کتابیں اہم مراجع کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی اہم تصنیف ''مفاتیح الغیب فی التفسیر القرآن'' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت تصانیف ہیں۔ ایک کتاب ''اسرار التنزیل و

انوار التأویل'' بھی ہے۔ ان کی تفسیر میں فنونِ طب، منطق اور فلسفہ شامل ہیں۔ جن کی وجہ سے آیات انطباق میں بہت خطائیں واقع ہیں۔ اسی لئے بعض علماء نے کہا ہے۔ کہ رازی کی تفسیر میں بہت کچھ ہے مگر قرآن کی تفسیر نہیں ہے۔

(۵) الزمخشری

نسبہ وحیاتہ: ابو القاسم محمود بن عمر الخوارزمی الزمخشری۔ رجب کی 27 تاریخ ۴۶۷ هجریہ میں پیدا ہوئے اور خوارزم کی بستی جرجانیہ میں ۵۳۸ میں فوت ہوئے۔ ان کا مولد خوارزم کی ایک بستی زمخشر ہے۔ ابتدائی علوم وہیں حاصل کئے پھر مزید علوم کی طلب میں مکہ گئے۔ وہاں اپنے شیخ منصور ابی مُضر سے علمِ ادب حاصل کیا۔ اور وہیں اپنی تفسیر ''الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التأویل'' تألیف کی۔

انہیں مکہ میں اقامت کی وجہ سے ''جار اللہ'' کا لقب دیا گیا۔ ان کی وفات پر کسی شاعر نے ایک شعر مرثیہ کے طور پر کہا ہے:

''فأرض مكة تذری الدمع مقلتها .... حزنا لفرقة جار الله محمود''

''مکہ کی زمین جار اللہ کی جدائی کے غم میں آنسو بہا رہی ہے۔ جار اللہ بہت تعریف کے حامل تھے''۔ زمخشری لغت، معانی اور بیان کے امام تھے۔ نحو اور بلاغت کی کتابوں میں زمخشری کی کتابوں کے بہت سے حوالے ہیں۔ **مذھبہ وعقیدتہ:** زمخشری حنفی المذہب، معتزلی العقیدہ تھے۔ ان کی تفسیر ''الکشاف'' مفسرین کی کتابوں میں تفسیر بالرائی سے مشہور ہے۔ آیات کی تأویل اپنے مذہب کے مطابق کرتے ہیں۔

(۶) الشوکانی

نسبہ وحیاتہ: القاضی محمد بن علی بن عبداللہ الشوکانی ثم الصنعانی الامام المجتھد ناصر السنۃ و قامع البدعۃ ۱۱۷۳ ہجریہ میں شوکان نامی شہر میں پیدا ہوئے۔ صنعاء میں پروان چڑھے، قرآن پڑھا اور علم کی طلب میں عظیم علماء سے سماع کیا۔ نحو، صرف، بلاغت اور بحث ومناظرہ کے اصول وآداب کے بہت سے فنون سیکھے۔ بیان ومعانی کے امام مشہور ہوئے اور ۱۲۵۰ ہجریہ میں فوت ہوئے۔

مذھبہ وعقیدتہ: امام زید کی فقہ سیکھی۔ اس میں مہارت حاصل کی اور اسی کے مطابق فتوے دیئے۔ علم حدیث کو ترجیح دی اور تقلید کی پٹی گلے سے اتار دی۔ سنت ناصر اور سنت کے مخالفین کی تردید کی۔ اس بارے میں ایک رسالہ تألیف کیا۔ ''القول المفید فی ادلۃ الاجتھاد والتقلید'' مؤلفاتہ۔ مختلف فنوں میں ان کی کئی تألیفات ہیں۔ ان کی تفسیر ''فتح القدیر'' اور اس کی شرح نیل

الأوطار'' اور یہ فقہی ابواب پر بہترین کتاب ہے۔ایک ان کی کتاب ''ارشاد الفحول'' اصول فقہ پر مشتمل ہے۔اوران کے فتاوی کے مجموعے کا نام ''الفتح الربانی'' ہے۔تفسیر ''فتح القدیر'' میں جلیل القدر مفسرین کے حوالہ جات ہیں۔اوراس میں نصوص الآیات کے مطابق روایات اور استنباطات شامل ہیں اور یہ تفسیر پوری مسلم دنیا میں متداول ہے۔یعنی دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔

وصلی اللہ علی رسولنا محمد و علی آلہ و صحبہ اجمعین۔